پہاڑی کا قیدی

تحریر: نمرہ احمد

READER BURAQ

پیش لفظ

ہر مصنف مختلف تخلیقات کو وجود میں لاتا ہے۔ کچھ تحاریر اس کو متعارف کرواتی ہیں، کچھ سے اس کی پہچان بنتی ہے، کچھ اسے معروف کر دیتی ہیں اور کچھ صرف مشہور..........

مگر بعض کہانیاں مصنف کا قاری پہ اعتماد قائم کرتی ہیں۔ وہ اس کا تعارف ایک نئے انداز سے کرواتی ہیں، اس کو مشہور بھی کرتی ہیں اور معروف بھی، اور اس کی پہچان بن جاتی ہیں۔ مداح اور نقاد دونوں کو متاثر کرتی ہیں۔ ''پہاڑی کا قیدی'' بھی میری ایسی ہی ایک تحریر ہے۔ اعلیٰ عدلیہ کی آزادی کی تحریک کے دوران میں نے اسے اوریا مقبول جان کے کالم ''آندھی'' کی بنیاد پہ فیکٹ و فنکشن سٹائل میں لکھا، اور یہ میرے ناقدین کو ملنے والا خوشگوار حیرت کا ایک جھونکا تھا کیونکہ میرے قلم سے اس طرح کی تحریر کی انہوں نے توقع نہیں کی تھی۔ اس کو پسند کرنے اور اس کو یادگار بنانے کے لیے میں اپنی تحاریر کے تمام مداحوں اور ناقدین کی شکرگزار ہوں۔

کسی بھی کتاب کو کامیاب بنانے کے لیے جتنی کوشش رائٹر کو کرنی پڑتی ہے۔ اتنی ہی کوشش پبلشر کو کرنی پڑتی ہے۔ پچھلے کچھ عرصہ میں میری کتابوں کے حقوق اشاعت حاصل کرنے کے بعد ادارہ علم و عرفان نے اس ذمہ داری کو میری توقعات سے زیادہ بہتر طور پر ادا کیا ہے۔ میں امید کرتی ہوں کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد قارئین میری اس رائے سے اتفاق کریں گے۔

نمرہ احمد

پہاڑی کا قیدی

چھت پر لگا پنکھا معمول کے مطابق سُست روی سے گھوم رہا تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ جہاں گرمی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا' وہاں بجلی بھی ہلکی ہوتی جا رہی تھی۔ نہ صرف گرمی بلکہ پنکھے کے پروں کے گھومنے سے پیدا ہونے والی گڑ' گڑ کی آواز بھی میرے لیے کوفت کا باعث بنی ہوئی تھی۔

''مجھے کسی نہ کسی طرح ایک کولر خرید لینا چاہیے۔'' گرمی کی حدت سے پریشان ہو کر میں نے بے اختیار سوچا تھا۔ میں نے پسینہ پونچھتے ہوئے پلٹ کر بستر پر سوئے عدی کو دیکھا۔ اس کا چہرہ ہلکا ہلکا گیلا تھا' مجھے یکدم بے چینی ہوئی۔ میز پر کاپیاں چھوڑ کر میں لپک کر بستر پر آئی اور اپنے دوپٹے سے عدی کی پیشانی سکھائی۔

''مجھے واقعی کولر لے لینا چاہیے۔'' ہاتھ والا پنکھا اسے جھلتے ہوئے میں نے سوچا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ پُرسکون ہو کر سو گیا۔

کاپیاں چیک کرتے ہوئے میں نے ایک نظر گھڑی کو دیکھا' رات کے ساڑھے بارہ ہو رہے تھے۔ مجھے صبح ساڑھے پانچ بجے حسبِ معمول اٹھنا ہی تھا اور پھر کل تو بہت ڈھیر سارے کام کرنے تھے۔ عدی کا اسکول میں ایڈمیشن اور کولر کے لیے اسکول سے ادھار' تنخواہ اور دیگر کاموں کی ایک لمبی فہرست تھی۔ سر جھٹک کر میں ایک دفعہ پھر کاپیاں چیک کرنے میں مصروف ہو گئی۔

رابعہ نورین کی کاپی پر میں ''خوش خط لکھا کیجیے'' نوٹ لکھ ہی رہی تھی کہ عدی کی آواز مجھے اپنی ریب سے سنائی دی' وہ نیند سے اٹھ بیٹھا تھا۔ میں جھٹ کے پاس آئی۔

اس کو کھانسی آ رہی تھی' ساتھ ہی اس کے سے ''خر۔خر'' کی وہ مانوس آواز بھی سنائی دے تھی' جو میں پچھلے کئی برس سے اس وقت سنتی' جب اس کا دمہ بگڑتا تھا۔

میں نے اسے شانوں سے تھام کر اپنے ساتھ لگالیا اور ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل سے اس کا کوئیک ریلیف اِن ہیلر اٹھایا۔

''بس بیٹا! ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس کو دیتے ہوئے میں نے ان ہیلر کو اچھی طرح اوپر ہلایا۔

''سانس لو عدی!'' مگر پچھلے کافی عرصے سے جانے والا فقرہ اب میرے لبوں سے جدا نہیں تھا۔

میں نے اِن ہیلر کے ماؤتھ پیس سے ڈھکنا اتارا اسے عدی کے لبوں سے لگایا۔ اس نے آہستہ آہستہ سانس اندر کو کھینچا' میں نے کنستر کو دبایا۔ دوائی کا پف اس کے منہ کے اندر تک پہنچ گیا تھا۔ اِن ہیلر اس کے لبوں سے ہٹا کر میں عادتاً بولی۔ ''اب سانس لو۔''

اس نے آہستہ آہستہ سانس باہر نکالا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ میرے دل کو کچھ ہوا تھا۔

''بس بیٹا! ابھی ٹھیک ہو جائیگا۔'' میں نے گھڑی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ٹھیک ایک منٹ بعد مین نے یہ سارا عمل دوبارہ دُہرایا۔ اب عدی کا تنفس بحال ہو چکا تھا' اس کے سینے سے آنے والی خرخر کی آواز ختم ہو چکی تھی۔ وہ پُرسکون ہو کر لیٹ گیا آنکھیں موند لیں۔

کتنی ہی دیر اس کے ساتھ بیٹھی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔

اس کا سر تکیے پر ڈال کر میں واپس کرسی پر آ گئی اور کاپیاں چیک کرنے لگی۔

کاپیاں چیک کرنے کے بعد میں انہیں میز کے اوپر ترتیب سے رکھ کر واپس عدی کے پاس بستر پر آ گئی۔ چھ سالہ عدی ہلکے ہلکے خراٹے لے رہا تھا۔ مجھے بے ساختہ اس پر بے حد پیار آیا۔ اس کے چہرے پر جھک کر میں نے اس کی پیشانی چومی۔ پھر اس کا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ میں لے لیا اور تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

پورے دن کی تھکاوٹ کے باعث جلدی ہی نیند نے مجھ پر اپنا غلبہ کر لیا۔ میری آنکھ اس ''خرخر'' کی مانوس آواز سے کھلی تھی۔ میں یکدم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ عدی کو نیند میں کھانسی آ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے اس کا ان ہیلر اٹھایا' پھر اسے شانوں سے پکڑ کر اٹھایا۔

اس کا استھما ہمیشہ رات کو یا صبح صادق کے وقت بگڑتا تھا۔ اسی لیے میں بہت الرٹ نیند سوتی

تھی۔ بلکہ میں تو شاید ساری رات سوتی بھی نہیں تھی۔

اِن ہیلر سے دوائی کے دو پف لے کر وہ ایک دفعہ پھر پُرسکون ہو کر لیٹ گیا تھا۔ اب کی بار اسے نیند قدرے دیر سے آئی تھی مگر پھر بھی وہ نیند کی وادیوں میں اتر ہی گیا۔

میں نے ایک دفعہ پھر لیٹتے ہوئے گھڑی کی جانب دیکھا۔ ساڑھے تین ہو رہے تھے۔ اب نیند کا آنا مشکل تھا۔

صبح کی اذان ہوئی تو میں نماز پڑھنے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جعفر آباد میں سخت گرمیوں میں پانی گرم اور سردیوں میں ٹھنڈا ہوتا تھا۔ اس گرم پانی سے وضو کر کے میں نے نماز پڑھی۔ سلام پھیرنے کے بعد جب دعا لیے ہاتھ اٹھائے تو آنسو ٹپ ٹپ کر کے میری آنکھ سے گرنے لگے۔ میں خالی خالی نگاہوں سے اپنے اٹھے ہوئے ہاتھوں کو دیکھتی رہی۔ مجھے اللہ سے کیا مانگنا تھا' میں دعا میں روتی تھی اور اگر کچھ مانگتی بھی تھی تو وہ عدی لیے ہوتا تھا۔ عدی کی صحت اور اچھی زندگی۔ اس لیے میں نے کبھی کچھ نہ مانگا تھا۔ میری سانسیں میرے بیٹے کے ساتھ بندھی تھیں' اس کی سانس رکتی تھی میری بھی رکتی تھی۔ وہ بے چین ہوتا تھا تو میں اس سے زیادہ بے چین ہوتی تھی۔ اس وقت بھی میں نے صرف اور صرف عدی کے لیے دعا کی' پھر جائے نماز تہہ کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں عدی کو سوتا چھوڑ کر کچن میں آ گئی اور اپنے اور عدی کے لیے ناشتہ بنانے لگی۔

عدی ٹوسٹ اور شہد بہت شوق سے کھاتا تھا۔ میں خالی ٹوسٹ اور چائے پر گزارا کرتی تھی۔ مگر آج چائے لیے دودھ نہیں تھا۔ مجھ یاد آیا۔ دودھ تو کل صبح ختم ہو گیا تھا۔

''آج لے آؤں گی۔'' میں نے خود کو دِلاسا دیا حالانکہ میں جانتی تھی کہ مہینہ ختم ہونے میں پورے دس دن پڑے تھے' جبکہ میری تنخواہ ختم ہونے والی تھی۔ ڈبل روٹی کا پیکٹ کھولا تو اندر صرف تین سلائس باقی تھے۔ ''اللہ مالک ہے۔'' میں نے شانے جھٹکے اور انہیں واپس پیکٹ میں ڈال دیا۔ عدی کے اٹھنے میں کافی وقت تھا' اسی لیے میں ناشتہ بنانے کی بجائے باہر چھوٹے سے برآمدے میں آ گئی اور جھاڑو اٹھا کر گھر کی صفائی کرنے لگی۔

صفائی عموماً میں جلدی کر لیا کرتی تھی مگر عدی کی وجہ سے میں احتیاط سے صفائی کرتی تھی۔ دھول اور گرد سے اس کا سانس بگڑتا تھا' اسی لیے میں نے سوائے اپنے کمرے کے باقی پورے گھر کی صفائی کر ڈالی۔

ہمارا گھر دو کمروں' ایک چھوٹے برآمدے' کچن اور چھوٹے سے صحن کے کنارے بنے ہاتھ روم پر مشتمل تھا۔ دوسرا کمرہ بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

گھر کی صفائی کر کے میں نے کپڑے تبدیل کیے' منہ ہاتھ دھو کر اپنے روکھے بالوں میں کنگھی کی اور ایک تنقیدی نگاہ خود پر ڈالتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ جہاں عدی سو رہا تھا۔

''عدی...! بیٹا! اٹھ جاؤ۔'' اسے نہایت نرمی سے آواز دے کر میں نے اٹھایا۔ وہ ایک ہی آواز پر اٹھ جانے والا بچہ تھا۔ سو اس وقت بھی آنکھیں ملتا اٹھ بیٹھا۔

اسے اٹھا کر میں باتھ روم لے گئی' اسے نہلایا' اور نہایت اچھی طرح ٹوتھ برش کرایا' کیونکہ ان ہیلر کے پف کے بعد اگر حادثاتی طور پر دوائی کا کوئی قطرہ اس کے منہ میں رہ جاتا تو اندر فنگس پیدا کر سکتا تھا' میں اس کی صحت کے بارے میں ہمیشہ سے کانشس رہا کرتی تھی۔

اس کو نہلا دھلا کر صاف نیکر شرٹ پہنا کر میں نے اسے برآمدے میں رکھی چارپائی پر بٹھا دیا اور خود ش کچن میں آ کر ناشتہ بنانے لگی۔

''ماما۔ بھوک لا۔ گئی ہے۔'' عدی ہمیشہ ہر لفظ کو کھینچ کھینچ کر بولتا تھا۔ ہر بات کرنے سے پہلے بہت سوچتا تھا اور کسی بھی بات کو دیر سے سمجھتا تھا۔ ''آئی۔ میری جان!'' جلدی جلدی تینوں توس سینک کر شہد کا جار اٹھایا اور فوراً باہر آ گئی۔

''یہ۔ لو۔'' میں نے دو ٹوسٹوں پر شہد لگا کر اس کی جانب بڑھایا اور تیسرا اپنی پلیٹ میں رکھا۔

اس نے ایک شہد لگا توس اٹھایا اور منہ کی جانب بڑھایا۔

''اوں ہوں۔'' میں نے فوراً روکا ''پہلے اس کو فولڈ کرو۔'' اس نے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا' کچھ دیر وہ مجھے دیکھتا رہا' پھر توس کو دیکھا۔

''اسے فولڈ کرو' جیسے ماما کرتی ہیں۔'' عدی کو میز ز سکھانا خاصا مشکل کام تھا۔ اس نے غور سے توس کو دیکھا' پھر دونوں ہاتھوں سے اسے فولڈ کر دیا۔ میں بے اختیار مسکرا دی۔

''میرا اچھا بیٹا! چلو اب بسم اللہ پڑھ کر کھاؤ۔'' اس نے بسم اللہ پڑھ کر اسے کھانا شروع کر دیا۔ میں اپنے توس کو ہاتھ لگائے بغیر اندر بڑھی اور چند سیکنڈ بعد ہیر برش لے کر باہر آئی۔ تب تک عدی اپنا پہلا توس ختم کر کے دوسرا شروع کر چکا تھا۔ مگر اس نے اس کو فولڈ نہیں کیا تھا۔

''عدی بیٹا! پہلے اس کو فولڈ کرو۔'' میرے کہنے پر اس نے آہستہ سے توس کو فولڈ کیا اور کھانے لگا۔

''میرا بیٹا آج شہزادہ لگ رہا ہے۔'' اس کے بھورے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے میں نے بہت

پیار سے کہا۔ وہ توس کھاتا رہا۔

''آج ہم عدی کو اسکول میں داخل کرائیں گے۔ ہاں'' اسکول کے ذکر پر اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں وہی چمک آگئی جو ہر دفعہ اسکول کے ذکر پر اس کی آنکھوں میں آجاتی تھی' مگر جلدی ہی اس کا چہرہ مرجھا گیا۔

''وہ مجھے نہیں داخل کرتے۔'' اس نے مایوسی سے کہا تھا۔ میرا دل کٹ کر رہ گیا۔

''نہیں عدی! وہ تمہیں داخل کرلیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''تم دیکھنا! آج ہم اچھے والے اسکول میں جائیں گے۔''

وہ بڑا ہو رہا تھا' محسوس کرسکتا تھا کہ اسے روز ہی کسی نہ کسی اسکول سے ریجیکٹ کر دیا جاتا ہے اور تو اور میرے اپنے اسکول نے عدی کو داخلہ نہیں دیا تھا۔

''یہ گندے والے اسکول ہیں۔'' وہ نفی سر ہلا کے بولا۔ ''مجھے گندا بچہ کہتے ہیں۔ میں گندا بچہ نہیں ہوں۔''

''نہیں' عدی تو بہت اچھا بچہ ہے۔ چلو عدی! اب جوتا پہنو۔'' دل پر پتھر رکھ کر میں نے آخری فقرہ کہا تھا۔

عدی کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے منہ بنا کر نفی میں زور زور سے سر ہلا دیا۔'' مجھے جوتا نہیں پہننا۔''

''عدی۔ پلیز بیٹا! ماما کی بات مانتے ہیں۔''

میں نے اسے پیار سے پچکارنا چاہا مگر اندر میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

''یہ والا جوتا نئیں پہننا۔'' اس نے بدستور نفی میں سر ہلایا۔

''کیوں نہیں پہننا' عدی؟''

''ماما اور کوئی بھی' یہ والا نئیں پہننا' صرف میں پہنتا ہوں۔ سب کے پاس اپنے جوتے ہیں' مجھے اللہ میاں نے کیوں نئیں دیا؟'' وہ میرے ہاتھ میں موجود لکڑی کے مصنوعی پاؤں کی جانب اشارہ کر کے کہہ رہا تھا۔

عدی پیدائشی طور پر بائیں پاؤں سے معذور اور ذہنی طور پر ایب نارمل تھا۔ دمہ کا مرض اسے بہت بچپن سے تھا لیکن صرف یہی ہوتا تو گزارہ اتنا مشکل نہیں تھا' اس کی معذوری اور ایب نارملٹی نے اسے دوسرے بچوں سے بہت پیچھے دھکیل دیا تھا۔ اسے کسی بھی عام اسکول میں داخلہ نہیں ملتا تھا۔ ہر اسکول کا پہلا اعتراض یہی ہوتا تھا کہ وہ معذور ہے۔ اگر کوئی اسکول اس کی مصنوعی ٹانگ پر مطمئن ہو بھی جاتا' تب بھی سوئی اس کے ایب

نارمل ہونے پر اٹک جاتی تھی۔ وہ پانچ سال کا ہو رہا تھا، مگر اس کو پچھلے ایک برس سے کسی اسکول میں داخلہ نہیں مل رہا تھا۔ ہر ماں کی طرح میری بھی یہی خواہش تھی کہ میرا بیٹا شہر کے سب سے اچھے اسکول میں پڑھے، مگر اسے تو سرکاری اسکول بھی رکھنے کو تیار نہیں تھے۔ نہایت ذہین اور عقل مند انسانوں کی دنیا میں مینٹلی ریٹائرڈ ہونا ایک سنگین جرم تھا۔

''اللہ میاں نے عدی کو لکڑی والا جوتا تو دیا ہے نا، عدی اتنا گندہ بچہ تو نہیں ہے کہ اللہ میاں کی دی ہوئی چیز نہ پہنے؟''

یہ وہ دلیل تھی جو پچھلے کئی ہفتوں سے ہر دوسری صبح میں عدی کو دیتی تھی۔ وہ صرف اس بات پر جوتا پہننے کو تیار ہو جاتا تھا۔ حالانکہ مجھے اتنا اندازہ تھا کہ عدی کو میری بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

اس نے نہ سمجھتے ہوئے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے لکڑی کا مصنوعی پاؤں نہایت مہارت کے ساتھ عدی کی پنڈلی سے جوڑ دیا۔ اس کے اوپر جوتا پہنایا اور پھر پیار سے اس کا ماتھا چوما۔

''عدی کو اچھے والے اسکول میں داخلہ ملے گا۔'' اپنے بیٹے کو امید دلا کر میں خود بھی پُر امید ہو گئی تھی۔ ماں تھی نا، ناامید نہیں ہو سکتی تھی۔

اپنا دوسرا توس ختم کر کے عدی نے میری پلیٹ میں رکھے توس کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ میں نے جلدی سے وہ توس اٹھا کر شہد لگایا اور عدی کو تھما دیا۔ وہ اسے فولڈ کیے بغیر کھانے لگا۔ اب کی بار میں نے اسے کچھ نہیں کہا، بس مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے یہ بھول جانے کی کوشش کی کہ میں نے رات کو کھانا نہیں کھایا تھا اور یہ بھی کہ آج میں چائے بھی نہیں پی تھی۔ مگر کیا فرق پڑتا تھا، میرے بیٹے کا پیٹ بھر رہا ہے، مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہیے تھا۔

میں عدی کے ہمراہ گھر سے باہر نکلی۔ دروازے پر تالا ڈالا اور اس کی انگلی تھام کر گلی سے ہوتی ہوئی سڑک پر آ گئی۔

ہمارے محلے کی بے پناہ غربت اور زبوں حالی کے باوجود ایک اچھی بات تھی کہ یہاں شریف لوگ بستے تھے اور مجھ جیسی بیوہ اور معذور بچے کی ماں سے ہمدردی رکھتے تھے۔ وہاں لوگ میرے بچے پر ترس تو کھاتے تھے، اس سے ان کو بے پناہ مخلصانہ قسم کی ہمدردی بھی تھی، مگر وہ اس سے پیار نہیں کرتے تھے۔ مجھے علم تھا کہ میرے علاوہ پوری دنیا میں کوئی شخص عدی سے پیار نہیں کرتا۔ شاید اسی لیے میں اسے ایسا بنانا چاہتی تھی کہ

لوگ اس پر ترس کھانے کے بجائے اس سے محبت کریں۔

بس اسٹاپ تک کا فاصلہ ہم پیدل طے کیا کرتے تھے۔ میں عدی کو گود میں نہیں اٹھاتی تھی' میں اسے خود انحصاری سکھانا چاہتی تھی۔ وہ کسی کا محتاج ہو' مجھے گوارا نہ تھا۔

''ماما! بارش ہے؟'' وہ غالباً پوچھنا چاہ رہا تھا کہ .... ''بارش ہوئی ہے؟'' میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ وہ نیچے گیلی زمین کو دیکھتے ہوئے قدم اٹھا رہا تھا۔

''نہیں بیٹا! یہ پانی پھینکا ہے کسی نے۔'' عدی کو بارش کی میں نے صرف کہانیاں سنائی تھیں اپنی زندگی میں اس نے جعفر آباد میں صرف رم جھم دیکھی تھی' وہ بھی بہت کم۔ اس کو صرف ایک موسم کا نام آتا تھا۔ ''گرمیاں۔'' جعفر آباد میں دوسرا کوئی موسم نہیں ہوتا تھا۔

بس اسٹاپ کے رستے میں ایک کھلا میدان آتا تھا۔ ہم روز جب اسکول سے واپس آرہے ہوتے' تو اس میدان میں لڑکے کرکٹ کھیلتے دکھائی دیتے۔ عدی بہت حسرت سے ان کو دیکھتا تھا۔

میدان پار کر کے ہم بڑی سڑک پر آگئے۔ بس اسٹاپ پر لوگوں کا رش کا خاصا کم تھا۔ میں اور عدی ایک جانب کھڑے ہو کر بس کا انتظار کرنے لگے۔

اس فٹ پاتھ پر ایک فقیر بیٹھتا تھا۔ عدی اس کو کبھی دل چسپی کبھی خوف سے دیکھا کرتا۔ میں انتظار کرتی کہ کبھی تو وہ اس کے بارے میں مجھ سے سوال کرے گا۔ مگر عدی سوچنے اور سمجھنے کی حس سے معذور تھا۔

''یہ کون ہے عدی؟'' اس دن مجھ سے رہا نہ گیا تو میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔ جواب میں وہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔

''یہ فقیر ہے عدی! یہ پیسے مانگتا ہے۔ کون ہے یہ؟''

''فقیر۔ فقیر۔!'' اس نے دُہرایا۔ اور ایک بات عدی میں حیران کن تھی کہ چاہے وہ جتنا کند ذہن تھا' اس کو لوگوں کی شکلیں ضرور یاد رہتی تھیں۔

بس آچکی تھی' ہم دونوں اس کی جانب لپکے۔ بس اسٹاپ پر موجود لوگوں میں سے اکثریت کو معلوم تھا کہ عدی ایک معذور بچہ ہے' سو وہ ہم دونوں کے لیے راستہ چھوڑ دیا کرتے تھے۔ مجھے ان کا راستہ چھوڑنا اچھا لگتا تھا' مگر ان کی آنکھوں میں ترس و رحم دیکھ کر اتنا ہی غصہ چڑھتا تھا۔ کبھی کبھی میرا دل کرتا' وہ لوگ ہمارے لیے راستہ نہ چھوڑا کریں اور عدی بھی کسی دن چھلانگ لگا کر بس میں داخل ہو جائے تا کہ ان کو پتا چلے کہ وہ محتاج نہیں

ہے۔مگر عدی ایسا کرنے سے قاصر تھا۔

روز کی طرح وہ کھڑکی والی طرف بیٹھ گیا اور شیشے سے باہر دوڑتے مناظر دیکھنے لگا۔

''ماما۔طوطا۔'' اس نے یکدم میرا کندھا جھنجھوڑ کر مجھے کھڑکی سے باہر ایک دکان کے سامنے لگے پنجرے میں قید طوطے کی جانب متوجہ کیا۔اس کو تمام پرندے بالعموم اور طوطے بالخصوص پسند تھے مگر اس کے استھما کی وجہ سے میں اسے پرندوں اور جانوروں کے قریب نہیں جانے دیتی تھی۔

بس سُست رفتاری سے چل رہی تھی' میں نے قدرے فکرمندی سے کلائی سے بندھی گھڑی کو دیکھا۔ ایک دم مجھے احساس ہوا کہ کوئی میرے ساتھ کھڑا ہے۔میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ایک چالیس پینتالیس سالہ خاتون aisle پر کھڑی تھیں' جھٹکوں سے بچاؤ کے لیے انہوں نے راڈ پکڑ رکھی تھی۔میں فوراً اٹھ کھڑی ہوئی'' آپ بیٹھ جائیں۔''

''نہیں۔آپ...'' وہ انکار کرنے لگیں۔

''نہیں پلیز آپ بیٹھ جائیں۔'' میں آ کھڑی ہوئی۔وہ مشکور نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے سیٹ پر بیٹھ گئیں۔پھر ہاتھ میں پکڑا اخبار کھول کر پڑھنے لگیں۔

عدی نے گردن گھما کر ان خاتون کو دیکھا' پھر ان کے اخبار کو' اخبار پر بنی تصویر دیکھ کر وہ میری طرف چہرہ کر کے پوچھنے لگا۔''ماما! یہ کون ہے؟''

میں نے اخبار کی جانب دیکھا۔''یہ قائداعظمؒ ہیں۔''

''وہ کون ہے؟''

''بعد میں بتاؤں گی' عدی!'' مجھے یوں کھڑے ہو کر بولنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

وہ میری طرف خاموشی سے دیکھتا رہا۔وہ کسی بھی بات کو دیر سے سمجھتا تھا۔

ہمارا اسٹاپ آ گیا' ہم دونوں باہر نکلے اور اسی طرح ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چند قدم کے فاصلے پر موجود سرکاری اسکول کی عمارت کی جانب چل دیے۔

''ہم اچھے والے اسکول کب جائیں گے؟'' وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

''میں بچوں کو پڑھا لوں۔پھر! اچھا؟''

''اچھا۔'' اس نے میری بات دُہرائی۔

عدی کو میری پرنسپل صاحبہ کی جانب سے خصوصی اجازت تھی کہ وہ میرے ساتھ اسکول ٹائمنگ میں بیٹھ سکتا تھا۔ میں تیسری اور چوتھی جماعت کو معاشرتی علوم' جبکہ باقی پرائمری کلاسز کو اردو اور اسلامیات پڑھاتی تھی۔ میں نے صرف بی۔اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ جلد ہی شادی ہوگئی اور کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ یوں نوکری کرنا پڑے گی۔ اگر عدی کے بابا کا ڈیڑھ سال پہلے انتقال نہ ہو جاتا تو شاید میں ابھی گھر میں بیٹھی ہوتی۔ مگر زندگی میں وہی کچھ تو نہیں ہوتا جو سوچا جاتا ہے۔

چوتھی کلاس کا پیریڈ لینے میں عدی کے ہمراہ کلاس میں داخل ہونے ہی والی تھی کہ عدی کے چہرے پر تکلیف کے آثار دکھائی دیے۔ میں فوراً کلاس سے باہر رُک گئی اور جلدی سے اپنے چار سال پرانے پرس سے اس کا اِن ہیلر نکالا۔

''سانس لو'' اِن ہیلر کو ہلاتے ہوئے میں نے ہدایت جاری کی۔ وہ سانس باہر نکالنے لگا۔

اس کو اِن ہیلر کے دو پف دینے کے بعد اسے لیے کلاس روم میں داخل ہوئی۔

''عدی....! ادھر بیٹھ جاؤ۔'' کرسی کی جانب اشارہ کر کے یہ بات کہتی تھی مگر جس دن نہ کہتی' وہ اسی طرح دروازے میں کھڑا ٹکر ٹکر سب کو دیکھتا رہتا۔

میری بات پر وہ خاموشی سے اپنی مخصوص کرسی پر جا بیٹھا۔ میں نے کتاب کھول لی۔

جب میں سیکنڈ کلاس میں اپنا تیسرا پیریڈ لے رہی تھی تو عدی اس کلاس ____ میں اپنی مخصوص نشست سے اٹھ کر میرے قریب آیا۔

''باہر جانا ہے۔ ان ہیلر چاہیے۔''

میں نے پرس سے اس کا اِن ہیلر نکال کر اس کے حوالے کیا۔ اسی دوران میری حتیٰ المقدور کوشش رہی تھی کہ سیکنڈ کلاس کے بچے اس اِن ہیلر کو نہ دیکھیں کیوں کہ مجھے ان کے چہروں پر اپنے بیٹے کے لیے اُمڈ کر آنے والا تاسف زہر لگتا تھا۔ مگر بچے دیکھ چکے تھے' اور ان کے چہروں پر میرے ناپسندیدہ تاثرات بھی تھے۔

تیسرا پیریڈ بڑھا کر میں باہر آئی تو عدی مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ مجھے یکدم فکر ہوئی۔ وہ روزانہ اسکول میں موجود پلے گراؤنڈ دراصل ایک خالی گول قطعۂ اراضی تھا جہاں اسکول کا ہر گیم منعقد ہوتا تھا۔ عدی مجھے اس کے وسط میں بیٹھا نظر آیا۔

''عدی!'' میں بھاگ کر اس تک گئی۔ ''تم ادھر ہو۔ میں تمہیں ڈھونڈ رہی تھی۔''

وہ دونوں گھٹنوں کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنا کر سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''عدی! کیا ہوا ہے؟'' اس کے جھکے سر کو دیکھ کر مجھے پریشانی ہوئی۔ میں وہیں اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اس نے بھنویں ناراضی کے عالم میں سیکڑ رکھی تھیں اور ماتھے پر بل تھے۔

''کیا ہوا ہے؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟''

''اس نے میرا ان ہیلر چھین لیا ہے۔'' وہ رونے کے قریب تھا۔

''کس نے؟'' میں نے دہل کر پوچھا۔ یہ اس کا مہینے میں چوتھا ان ہیلر تھا جو گم ہوا تھا۔

''وہ لڑکا۔ اس نے مجھے مارا بھی ہے۔ ادھر۔'' اس نے اپنے سرخ گال کی جانب اشارہ کیا۔ آنسو اس کے چہرے پر پھسل رہے تھے۔

میں نے غصے اور بے بسی سے اپنے اطراف میں دیکھا کہ شاید مجھے وہ لڑکا نظر آ جائے مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

''تو تم نے اسے اپنا ان ہیلر چھیننے کیوں دیا؟ تم بھی اسے مارتے۔'' میں قدرے غصے میں کہتے ہوئے یکدم رونے لگی تھی۔

ہر دوسرے دن وہ ان ہیلر توڑ یا گم کر بیٹھتا تھا، میرے پاس پیسے ختم ہونے کے قریب تھے۔ ''میرے اللہ! میں اس کا ان ہیلر کہاں سے لاؤں گی۔'' بے بسی سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''ماما۔ روتی کیوں ہو؟'' میں نے آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ میں نے پہلے اس کے آنسو صاف کیے پھر اپنے۔

''چلو عدی......! ہم نیا ان ہیلر لے لیں گے۔'' میری بات پر وہ مسکرا دیا۔ میں مسکرا بھی نہ سکی۔

سیکنڈ لاسٹ پیریڈ میں جب ہم ون کلاس میں داخل ہوئے تو میں نے عدی کو حسبِ معمول اس کی جگہ پر بیٹھنے کو کہا مگر وہ نہیں بیٹھا۔

''بیٹھو نا' عدی۔''

''ماما! یہ اس نے۔'' اس نے درمیانی رو کے آخری بینچ پر بیٹھے لڑکے کی جانب اشارہ کیا۔ ''ماما یہ......

میرا ان ہیلر۔'' وہ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں مجھے کیا بتانا چاہ رہا تھا' میں اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔ غصے کی ایک لہر نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

''ادھر آؤ تم!'' نہایت تیز لہجے میں' میں نے آصف کو اشارہ کیا، اس کا رنگ فق ہو چکا تھا۔

''میرے عدی کا ان ہیلر تم نے لیا ہے؟''

''عدی جھوٹ نہیں بولتا۔'' عدی نے اس کی بات پر چلا کر کہا۔

''نکالو ان ہیلر ورنہ میں میڈم کے پاس چلی جاؤں گی۔'' میں نے لہجے کو مزید سخت بنا کر کہا۔

وہ گھبرا کر نفی میں سر ہلانے لگا۔

''عثمان، اس کا بیگ لاؤ ادھر۔'' عثمان نے قدرے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا بیگ اٹھایا۔ میں نے اس کا بیگ کھولا، سامنے عدی کا ان ہیلر پڑا تھا۔ طمانیت کی لہر نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا۔

''یہ دیکھو۔'' میں نے ان ہیلر نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ ''یہ ہے عدی کا ان ہیلر اور عدی جھوٹ نہیں بولتا۔ آئندہ خبردار تم نے عدی کو تنگ کیا۔ میں تمہارے ہاتھ توڑ دوں گی، اگر تم نے پھر ایسی حرکت کی تو۔''

عدی اپنا ان ہیلر پا کر بہت خوش تھا۔ خود میں بھی بے حد پرسکون تھی۔ اسکول سے واپسی پر جب ہم دونوں بس میں بیٹھے تھے، عدی کو کچھ یاد آ گیا۔

''ماما! وہ کون ہے؟'' مجھے یاد آیا اس نے کچھ پوچھا تھا۔

''قائداعظمؒ ہے، پاک تان بناتا۔ قائداعظمؒ ہے، پاک تان بنایا۔'' وہ حسب معمول میری بات دہرانے لگا۔

''ہم اچھے والے اسکول میں کل جائیں گے عدی!'' میں اس کو ایک دفعہ پھر جھوٹی تسلی دینے لگی۔ البتہ دل میں ایک امید ضرور تھی۔ آج مس رضیہ کے ذریعے میں نے میڈم تک سفارش پہنچائی تھی کہ عدی کو ہمارے اسکول میں ہی داخلہ مل جائے۔ امید کا ایک ٹمٹماتا ہوا دیا میرے اندر جل بجھ رہا تھا۔

اس نے میری بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ ہم لوگ خاموشی سے چلتے ہوئے اس کھلے میدان کے دہانے پر پہنچ گئے۔

سیاہ چادر میں لپٹی مسز مہدی مجھے اپنی جانب آتی دکھائی دیں۔ مسز مہدی نے پچھلے ماہ ہمارے اسکول

کی نوکری چھوڑی تھی۔ ان کو یوں سرِراہ دیکھ کر مجھے خوش گوار حیرت سی ہوئی۔ وہ اسی علاقے میں رہتی ہیں، یہ تو میں جانتی تھی مگر عدی کی وجہ سے زیادہ آتی جاتی نہیں تھی۔

''کیسی ہے مسز مہدی آپ؟'' ان کو گلے لگاتے ہوئے میں نے گرم جوشی سے پوچھا۔ عدی خاموشی سے قدرے فاصلے پر کھڑا ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

''بالکل ٹھیک۔ تم کیسی ہو؟ تم نے تو پلٹ کر خبر ہی نہیں لی۔'' ان کی زبان سے ہلکا سا شکوہ ادا ہوا۔ میں جھینپ کر مسکرا دی۔

''بس۔ یہ عدی اتنا بزی رکھتا ہے۔'' میں نے عدی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اب ہمارے بجائے گراونڈ میں کھیلتے اپنے ہم عمر بچوں کو حسرت سے دیکھ رہا تھا۔

''جاؤ عدی! ان سے کہو تمہیں بھی اپنے ساتھ کھلائیں۔'' مجھ سے اپنے بیٹے کی آنکھوں میں چھپی یہ حسرت دیکھی نہ جاتی تھی۔ اس لیے میں نے فوراً کہہ دیا۔ میری بات پر وہ پورے دل سے مسکرا دیا اور ان لڑکوں کی جانب بڑھ گیا۔

''اور سناؤ، ابھی تک جاب کر رہی ہو؟'' وہ مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔ میں نے گہری سانس لی۔

''جی، ابھی تک تو کر رہی ہو۔''

''عدی کو کہیں داخل کروایا؟''

''جی، اپنے اسکول میں ہی میڈم سے بات کی ہے، شاید چند دنوں میں اس کا وہیں داخلہ ہو جائے۔''

میں ان کو یہ بات نہیں بتا سکتی تھی کہ میڈم تو کیا، کئی دوسرے اسکول بھی انکار کر چکے تھے۔ اگر بتا دیتی تو وہ سمجھتیں کہ میرا بیٹا واقعتاً ایب نارمل ہے، عدی میں صرف تھوڑی کمی تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ ایک دن عام لوگوں کی طرح زندگی گزار سکے گا۔

مسز مہدی سے کھڑے کھڑے چند باتیں کرنے کے بعد میں انہیں خدا حافظ کہہ کر مڑی تو عدی مجھے اکیلا گراؤنڈ پار کر کے گھر کی جانب جاتا دکھائی دیا۔ مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ عدی کبھی میرے بغیر کہیں نہیں جاتا تھا۔

''عدی! کہاں جا رہے ہو؟'' پھولتے ہوئے سانس کے ساتھ میں اس کے قریب پہنچی اور اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر اس کا رخ اپنی جانب کیا۔

''عدی۔! تم......تم رو کیوں رہے ہو؟'' اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا۔

وہ روتے ہوئے میرے ہاتھوں کی گرفت سے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ چھڑانے لگا۔

''عدی۔میرا بیٹا کیا ہوا ہے؟'' اس کے ہاتھوں کو مضبوطی سے پکڑے میں نے فکرمندی سے پوچھا۔

''چھوڑ دو مجھے۔'' وہ ہاتھ چھڑاتے دبی دبی سسکیوں کے ساتھ رو رہا تھا۔

''عدی! پلیز بتاؤ مجھے۔'' میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

''وہ مجھے نہیں کھیلاتے۔'' وہ سسکیوں کے درمیان کہہ رہا تھا۔

''کیوں نہیں کھیلاتے؟'' میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

''وہ کہتے ہیں، میں لنگڑا ہوں، میں پاگل ہوں اور میرا منہ ٹیڑھا ہے۔'' وہ اب اونچی آواز میں رونے لگا تھا۔

''عدی!'' میں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ''وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ مگر عدی تو جھوٹ نہیں بولتا نا؟ روؤ نہیں۔ ماما کھلونا بھی لے کر دی گی۔'' اس کا ماتھا چوم کر میں نے اسے کے آنسو صاف کیے۔ میری بات پر اس نے رونا بند کر دیا تھا۔

''چلو آؤ۔'' اس کا ہاتھ پکڑ کر میں نے پیار سے کہا اور اسے ساتھ لیے اپنے گھر کی جانب چل دی۔

✿......✿......✿

''قائداعظمؒ ہے۔ پاک تان بنایا ہے۔'' میں نے عدی کے ہاتھ میں جیسے دس روپے کا نوٹ تھمایا، اس نے فوراً ہی نوٹ پر بنی تصویر کو دیکھ کر کہا۔ مجھے حیرت کا جھٹکا لگا اور پھر ان لوگوں پر غصہ آیا جو میرے بیٹے کو ذہنی طور پر معذور سمجھتے تھے۔ کوئی ذہنی طور پر معذور انسان اتنی اچھی طرح شکلیں یاد نہیں رکھ سکتا تھا جیسے عدی رکھتا تھا۔

جتنی دیر ہم دونوں بس میں بیٹھے رہے، عدی قائداعظمؒ کی گردان کرتا رہتا۔

بس ہمارے مطلوبہ اسٹاپ پر رکی، میں نے عدی کا ہاتھ پکڑا اور نیچے اتر گئی۔ آج ہمارا اسٹاپ اسکول نہیں، بلکہ سرکاری اسپتال تھا، جہاں سے عدی کی دوائی لینا تھی۔

اس کا ان ہیلر ختم ہو چکا تھا اور مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ مہینے کے آخری پانچ دن مجھے فاقے کرنے پڑیں گے، مگر عدی کی بیماری پر میں کوئی کمپرومائز نہیں کر سکتی تھی۔

میں نے سنا تھا کہ سرکاری اسپتال میں مفت دوائیاں ملتی ہیں، مگر وہ پتا نہیں کون سی جادونگری تھی، جہاں دوائیاں مفت ملتی تھیں۔ میرے بچے کا نہ کہیں مفت علاج ہوا تھا، نہ ہی اسے مفت دوائیاں ملی تھیں۔ کیمسٹ کے سامنے ایک لمبی قطار کے آخر میں ہم دونوں کھڑے ہو گئے۔

''ماما۔ وہ طوطا۔'' عدی نے میرا دوپٹہ پکڑ کر قدرے کھینچا۔ میں نے گردن پھیر کر اس کو دیکھا۔

''کدھر ہے؟''

''وہ...... ماما!'' اس نے دور ٹینکی پر بیٹھے کوے کی جانب اشارہ کیا۔ مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

''وہ کوا ہے، طوطا نہیں ہے۔ عدی!'' میں نے اسے سمجھانا چاہا۔

''طوطا ہے ماما!'' وہ بضد تھا۔

''عدی! اس کا رنگ بلیک ہے، طوطا تو گرین ہوتا ہے جانو!''

''ماما۔ وہ گین (گرین) ہے۔'' وہ اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

''اچھا بیٹا! طوطا ہی سہی۔'' میں نے ہار مان لی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پھر میرا دوپٹہ کھینچا۔

''ہوں۔ کیا بات ہے؟'' میں نے اس کی جانب چہرہ کیا۔ ''ماما۔ وہ طوطا۔'' اس نے پھر ٹینکی کی جانب اشارہ کیا۔ عدی کو ہر بات دہرانے کی عادت تھی۔

''ماما! اِدھر نہیں۔ اُدھر۔''

اس کے اشارہ کرنے پر میں نے بجلی کی تار کی طرف دیکھا۔ وہاں واقعی ایک طوطا بیٹھا تھا۔

''تم وہاں اشارہ کر رہے تھے؟ میں سمجھی ادھر کر رہے ہو'' میں نے شرمندگی سے کہا۔ البتہ دل میں مجھے بہت خوشی ہوئی کہ عدی بڑا ہو رہا ہے اور سیکھ رہا ہے۔

ہماری باری آ گئی، میں قدرے آگے بڑھی۔

''Ventoline کا ایک ان ہیلر چاہیے۔''

''ڈھائی سو روپے کا ہے۔'' وہ بڑی بے نیازی سے بولا۔ میرا خون کھول اٹھا۔

''پچھلے ہفتے تو ڈیڑھ سو روپے کا تھا۔''

''بی بی دنیا بدل رہی ہے۔ مارشل لاء کی وجہ سے قیمتیں بڑھ گئی ہیں۔'' اس نے ایک جواز تراشا۔

''مارشل لاء تو پچھلے سال کے اکتوبر سے لگا ہوا ہے، قیمتیں اب کیوں بڑھی ہیں؟'' میں تنک کر بولی۔

''بی بی لینا ہے تو لو، ورنہ جاؤ۔''

میں نے بے بسی سے اسے دیکھا، پھر دو عدد سو اور ایک پچاس کا نوٹ نکال کر اس کو تھمایا اور ان ہیلر کا لفافہ پکڑا۔

''شرم نہیں آتی تمہیں لوگوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے؟'' جاتے جاتے میں جتانا نہیں بھولی تھی۔ میری بچتوں کے باوجود پیسے تیزی سے ختم ہو رہے تھے۔

''خیر! اللہ مالک ہے۔'' میں نے سر جھٹکا۔

بس اسٹاپ تک جاتے ہوئے راستے میں جعفر آباد کے ایک مین بازار کا فرنٹ آتا تھا۔ عدی دکانوں اور دکانوں کے آگے ریڑھیوں میں سجی چیزوں کو نہایت دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

''ماما! طوطا لینا ہے۔'' اس نے فرمائش کی۔

''عدی کا دمہ خراب ہوتا ہے۔ طوطے سے۔'' میں نے اسے سمجھانا چاہا۔

''پھر بلی لے لیں۔'' وہ ب لجاجت سے کہہ رہا تھا۔

''بلی بھی بیمار کرتی ہے۔'' میں نے بے چارگی سے کہا۔

''پھول بھی نہیں لینے؟'' اس نے نظریں پھول بیچتے آدمی پر مرکوز کیے پوچھا۔

''پھول سے بھی تو عدی کو الرجی ہے۔'' یکدم میرا دل بے حد اداس ہوا۔ عدی کو جو چیزیں پسند تھیں، ان سے اس کو الرجی تھی۔ ''کیا میرا بیٹا ساری زندگی ان چیزوں کو ترستا رہے گا؟''

''ماما! کھلونا لینا ہے۔'' ایک کھلونے والی ریڑھی کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ مچل کر بولا۔

عدی کے پاس گنتی کے صرف تین کھلونے تھے۔ میوں دس دس روپے والے ڈھائی سال پرانے تھے۔ جو عدی کو اس کے باپ نے لے کر دیے تھے۔ میرے وسائل میں اتنی گنجائش ہی کہاں تھی کہ میں عدی کو کھلونے لے کر دے سکتی۔

''عدی، یہ مہنگے کھلونے ہیں۔ یہ لے لیں گے تو کھانا نہیں کھا سکیں گے۔ میں عدی کو کچھ دن بعد لے دوں گی۔ پرامس۔''

''اس سے سر اٹھا کر نہایت شا کی نظروں سے سے مجھے دیکھا، پھر یکدم میرے ہاتھ میں پکڑائی ہوئی اپنی انگلی چھڑا لی۔

''مجھے کچھ نہیں چاہیے ماما!'' وہ ناراض سا ہو کر سائیڈ پر ھڑا ہو گیا اور دوسری جانب منہ پھیر لیا۔ میرا دل کٹ کر رہ گیا۔

''آؤ کھلونا لیں۔'' میں نے آگے بڑھ کر اسے پیار کیا، مگر اس کی ناراضی ختم نہیں ہوئی تھی۔ میں نے زبردستی اس کا ہاتھ پکڑا اور ریڑھی کی جانب لے گئی۔ اندر ہی اندر میرا دل بار بار ڈوب کر ابھر رہا تھا۔

''کتنے کا ہے یہ؟'' میں نے نسبتاً سستا سا ھلونا اٹھا لر ریڑھی والے سے پوچھا۔

''پچیس روپے۔''

عدی نے ایک پلاسٹک کاغذ میں لپٹا کانچ کا ڈیکوریشن پیس اٹھا لیا اور اسے محو ہو کر دیکھنے لگا۔

''پچیس روپے اتنے سے کھلونے کے؟ نہیں بابا! پندرہ لے لو۔''

"بیس روپے تو اماری خرید ہے، تم کہتی ہو پندرہ میں لے لو۔" وہ ریڑھی والا برہمی سے کہنے لگا۔

"کھٹاک" کی آواز پر میں نے دہل کر پیچھے دیکھا اور جو میں نے دیکھا وہ میرے اوسان خطا کرنے کے لیے کافی تھا۔ عدی نے جو کانچ کا ڈیکوریشن پیس اٹھایا تھا۔ وہ زمین پر گر پڑا تھا۔ پلاسٹک ریپر کے اندر ہی اندر اس کی کرچیاں ہو گئی تھیں۔

زمین اور آسماں میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے تھے۔ "عدی! یہ تم نے کیا کیا ہے؟" مجھے اپنی آواز کھائی سی آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔

"خانہ خراب کا بچہ...... یہ ساٹھ روپے والا گلدان توڑ دیا ہے، ریڑھی والے کی بات سن کر میرے رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے۔

"معاف کرو بابا! بچہ ہے غلطی ہو گئی۔ مم...... میں یہ پچیس روپے میں ہی لے لیتی ہوں۔"

"پہلے اس کے تو ساٹھ روپے دو۔" وہ بگڑے تیوروں سے کہہ رہا تھا۔

میں نے مرے مرے ہاتھوں سے اپنے پرس میں سے ساٹھ روپے نکال کر اس کے حوالے کیے اور پھر عدی کی انگلی تھام کر تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

شاید عدی کی قسمت میں کھلونا بھی نہیں تھا۔

✡......✡......✡

"تھینک یو سو مچ میم!" میری خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا، جب میڈم نے کہا کہ وہ عدی کو اسکول میں رکھنے پر تیار ہیں، مس رضیہ جیسی سینئر ٹیچر کی سفارش کام کر گئی تھی۔

میں عدی کو لے کر نرسری آئی اس کی ٹیچر مس ناز سے ملی، ان سے اس کا خاص خیال رکھنے کا کہا اور پھر عدی کو وہیں بٹھا دیا۔

"عدی! اب یہ تمہاری کلاس ہے۔"

"اچھی والی کلاس۔ ماما؟"

"ہاں۔" میں مسکرا دی۔ "اچھی والی کلاس۔"

اس کو اس کا ان ہیلر تھما کر اپنی کلاس میں واپس چلی آئی۔ تمام فکریں، پریشانیاں میرے ذہن سے محو ہو چکی تھیں۔

نہایت خوشگوار موڈ میں، میں نے کلاس کو پڑھایا، ان سے سبق سنا۔ اور پھر انہیں کام لکھوتی رہی۔
اگلے دو پیریڈ بھی اسی طرح ہنستے بولتے گزرے۔

چوتھے پیریڈ میں مس نازیہ میرے پاس آئیں۔

''آپ ذرا میرے ساتھ آئی۔'' وہ مجھے بلانے آئی تھیں۔ میرا دل یکدم دھک دھک کرنے لگا، پتہ نہیں کیوں میری ہر خوشی عارضی ہوتی تھی۔

''عدی ٹھیک ہے مس؟'' ان کے ہمراہ کاریڈور میں چلتے ہوئے میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''عدی نے فرحان کو مارا ہے۔'' انہوں نے آہستگی سے بتایا۔

''فرحان نے ضرور کچھ کہا ہوگا، ورنہ عدی مارنے والا بچہ نہیں ہے۔'' میں نے فوراً اپنے بیٹے کا دفاع کیا۔

مس ناز خاموش رہیں۔

عدی کی کلاس میں پہنچ کر میں نے دیکھا، ناراض ناراض سا لگ رہا تھا۔

''عدی!'' میں اس کی جانب لپکی ''کیا ہوا ہے بیٹا۔''

''ماما!'' مجھے دیکھ کر اس نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

''عدی! تم نے کیوں مارا فرحان کو؟ عدی تو اچھا بچہ ہے۔ اچھے بچے مارتے تو نہیں ہیں۔'' میں نے اسے پچکارا۔

''ماما! فرحان کہتا ہے میرا منہ ٹیڑھا ہے۔'' اس نے بھیگی آواز میں بتایا۔

عدی کے ہونٹ پیدائشی قدرے ٹیڑھے سے تھے جیسے عموماً ایب نارمل بچوں کے ہوتے ہیں۔

اس کے قریب کھڑے فرحان کو مخاطب کر کے میں نے کہا۔ ''آپ نے عدی کو ایسا کیوں کہا؟''

''آپ تو بہت اچھے بچے ہیں عدی آپ کا بھائی ہے، اس سے دوستی کرو۔ اس کے ساتھ کھلیا کرو۔ ہر کسی کو اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے، کسی کا مذاق اڑانے سے ہم اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی چیزوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ بہت غلط بات ہے بیٹا!'' میری بات پر فرحان نے قدرے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

''چلو فرحان! ہاتھ ملاؤ بھائی سے۔'' میں نے ہولے سے فرحان کا گال تھپتھپا کر کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بڑھا اور عدی سے ہاتھ ملایا۔ عدی بھی کھل کر مسکرایا۔

''شاباش۔اور دیکھو اب کوئی عدی سے نہیں لڑے گا۔'' ان دونوں نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔

ایک خاموش نگاہ ان پر ڈال کر میں وہاں سے چلی آئی۔ میرے بچے سے کوئی محبت نہیں کرتا، کوئی اس کی پرواہ نہیں کرتا، اس بات میں مجھے کوئی شک نہیں نہ رہا تھا۔

۞......۞......۞

''سانس لو اب۔'' اس کے ہونٹوں کے ساتھ ان ہیلر لگاتے ہوئے عادتاً میرے منہ سے یہ فقرہ نکلا۔

وہ آہستہ آہستہ سانس اندر کو کھینچنے لگا، جب دوائی اس کے گلے تک پہنچ چکی تو میں نے ان ہیلر ہٹا کر اس کا ڈھکن بند کر دیا۔

''جاؤ عدی! منہ دھو کر آؤ۔'' روز میں اس کا منہ دھلاتی تھی مگر آج میں اس کی خود انحصاری چیک کرنا چاہتی تھی۔

وہ خاموشی سے میرے ساتھ بیٹھا ہتھیلیوں کو دیکھتا رہا۔ میں نے ایک طویل سانس اندر کھینچی۔

''آؤ منہ دھلاؤں تمہارا۔'' اس کا ہاتھ پکڑ کر میں اسے باتھ روم میں لے گئی۔

''چند منٹ بعد جب اس کا منہ دھلا کر میں اسے سلا چکی تو نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے پرس میں موجود رقم دیکھی۔ حالانکہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا وہاں کتنے پیسے پڑے ہیں۔

تین سو دس روپے دیکھ کر میرے دل کو کچھ ہوا تھا۔ میں نے ایک تاسف بھری نگاہ عدی کی مصنوعی ٹانگ پر ڈالی۔ یہ ٹانگ قریباً ڈیڑھ سال پہلے عدی کے بابا نے آفس سے قرضہ لے کر اسے لگوائی تھی۔ آفس سے لیا جانے والا قرضہ سات ہزار تھا اور گزشتہ ایک برس سے میری اس قرضے کو ادا کرنے کی کوشش کے باوجود وہ سود کے باعث وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔

گزشتہ چار مہینے سے میں قرضے کی ایک قسط بھی نہیں دے پائی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پیسے کہاں سے اکٹھا کروں۔ عدی کے بابا کے آفس سے نوٹس پر نوٹس آ رہے تھے، وہ لوگ مجھے دھمکیاں دے رہے تھے، مگر میری تمام راہیں مسدود تھیں۔ مجھ سے اپنی قلیل تنخواہ کے باعث گھر کے خرچے ہی پورے نہیں ہوتے تھے، میں یہ قرضہ کہاں سے ادا کرتی ہوں؟ سود ادا کرتے کرتے میں نڈھال ہو چکی تھی۔

تمام رات بے چینی سے کروٹیں بدلتے گزری۔ ویسے بھی مجھے چھ ساڑھے چھ گھنٹے کی مکمل نیند لیے بھی تین چار برس سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ عدی کی وجہ سے میں کبھی ٹھیک سے نہیں سو پائی تھی اور اب تو یوں لگتا

تھا کہ انسومینیا کا شکار ہوتی جا رہی ہوں۔

''عدی پڑھتا نہیں ہے۔'' میری پریشانیاں کیا کم تھیں، جو صبح اسکول میں مس ناز نے مجھے گھیر لیا۔ ایک تھکی تھکی نگاہ ان پر ڈال کر میں نے کہا۔

''وہ بہت ذہین نہیں ہے مس ناز!'' میرے لہجے میں تھکاوٹ تھی۔

''ایک بات کہوں آپ سے۔'' وہ قدرے جھجک کر بولیں۔ ''آپ عدی کو کسی اسپیشل چلڈرن کے ادارے میں داخل کرا دیں۔ وہ عام بچوں کے ساتھ کبھی ٹھیک سے نہیں پڑھ سکے گا۔''

''ناز!'' میری آنکھوں میں مرچیں سی بھرنے لگی تھیں۔ ''اس کو صرف استھما ہے اور......اور اس کی ٹانگ نہیں ہے۔ وہ ذہنی طور پر معذور نہیں ہے۔ بے شک اس کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے مگر ڈاکٹرز کہتے ہیں اس کا آئی کیو عام بچوں سے کم سہی مگر وہ مینٹلی ریٹارڈ نہیں ہے۔'' لوگوں کو یہ یقین دلاتے دلاتے اب میں تھک چکی تھی۔

''ایسے بچے کو مینٹلی ریٹارڈ ہی کہتے ہیں۔'' وہ دھیرے سے بولیں۔

''عدی ایب نارمل نہیں ہے، جسمانی طور پر لاکھ بیماریاں ہوں...... ذہنی طور پر بھی بے شک وہ دوسرے بچوں سے سو گنا پیچھے ہے مگر......مگر ایب نارمل نہیں ہے۔'' آنسوؤں کا گولہ میرے حلق میں پھنس کر رہ گیا تھا۔

مس ناز نے سر ہلایا مگر مجھے معلوم تھا انہوں نے میری بات پر یقین نہیں کیا۔

گھر پہنچ کر میں پہلی دفعہ عدی پر غصہ ہوئی تھی۔

''تم پڑھتے کیوں نہیں ہو؟'' جب اس کو اپنے سامنے کرسی پر بٹھا کر میں نے قدرے غصے سے کہا تو وہ سہم کر مجھے دیکھنے لگا۔

''تم پڑھتے نہیں ہو اور......اور لوگ کہتے ہیں عدی ایب نارمل ہے۔ میری بات پر کیوں کوئی یقین نہیں کرتا؟ میں ڈاکٹرز کی رپورٹس بھی دکھا دوں تب بھی وہ یہی کہیں گے کہ عدی پاگل ہے۔ تم پڑھتے کیوں نہیں؟''......آنسوؤں نے میرا گلا بند کر دیا۔

''میں نے آج اسکول میں پڑھا ہے۔'' وہ بے ربط انداز میں مجھے بتا رہا تھا، میں روتے ہوئے سر اٹھا کر اسے دیکھے گئی۔

''میرے اللہ! میرے بیٹے کا کیا بنے گا؟ میں ان قرضوں اور پریشانیوں میں ہی مر گئی تو عدی کہاں

جائے گا؟''

''ماما روتی کیوں ہو؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت و استعجاب تھا۔ میرے دل نے کہا مس ناز کو کھینچ کر ادھر لاؤں اور دکھاؤں کہ عدی پاگل نہیں ہے۔ اگر پاگل ہوتا تو کبھی اپنی ماں کے آنسوؤں کی وجہ نہ پوچھتا۔

''مام!'' وہ میرے قریب آ کر اپنے ننھے منے ہاتھوں سے میرے گالوں پر بہتے آنسو صاف کرنے لگا۔ میں آنسوؤں کے درمیان بہت اذیت سے مسکرائی۔

''چلو عدی! کھانا کھائیں۔'' آنسو صاف کرتے ہوئے میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

اسے کھانا کھلا کر میں اسے پڑھانے بیٹھ گئی۔

''یہ کیا ہے؟'' جلی حروف میں لکھے ''الف'' پر انگلی رکھ کر میں نے اس سے پوچھا تھا۔

وہ گردن قدرے ترچھی کر کے قاعدے کو دیکھتا رہا۔

''عدی! یہ الف ہے۔ پڑھو الف۔ الف'' اس کی خاموشی پر میں نے بتایا۔

''آ۔لف۔''

''ہاں۔ شاباش اور یہ کیا ہے؟'' میں نے اب کے ''ب'' پر انگلی رکھی۔

اس نے خاموشی سے قاعدے کو دیکھا اور پھر مجھے۔

''پڑھو بے۔''

''بے۔'' وہ دہرانے لگا۔

''اچھا یہ کیا تھا؟'' میں نے واپس الف پر انگلی رکھی۔

''بے۔''

''نہیں عدی! جو میں نے بے سے پہلے بتایا تھا۔ وہ کیا ہوتا ہے؟''

''قائداعظمؒ نے پاکستان بنایا۔'' وہ ایک دم یاد کرتے ہوئے بولا۔

''نہیں عدی! اچھا یہ کیا ہے؟'' میں نے پھر سے ''بے'' کی جانب اشارہ کیا۔

اس نے شانے اچکا دیے۔

میں نے ایک تھکی تھکی نگاہ پر ڈالی۔

اگلے آدھے گھنٹے تک میری سر توڑ کوشش کے باوجود وہ کوئی لفظ یاد نہ کر سکا۔ ایک پڑھ کر اگلے پر جاتا تو پچھلا بھول جاتا، اگر ایک ہی حرف کئی دفعہ دہراتی تو بھی چند لمحوں بعد وہ ''الف۔ الف کہنے کی بجائے وہ ''قائداعظم'' کی گردان شروع کر دیتا۔

تھک ہار کر میں نے کتابیں ہی بند کر دیں۔

عدی یقیناً پڑھ سکتا ہے مگر شاید مجھ جیسی نااہل اور جاہل ماں میں پڑھانے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ ہمیشہ کی طرح میں نے خود کو موردِ الزام ٹھہرایا۔ عدی ذہنی طور پر معذور ہے، یہ بات تو میں ماننے کے لیے ہرگز تیار نہ تھی۔

✡……✡……✡

''محترمہ! یہ پانچواں مہینہ ہے، اگر آپ نے اٹھائیس تاریخ تک قسط نہ دی تو ہم پولیس سے رابطہ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔'' عدی کے بابا کی کمپنی کا مینیجر انتہائی درشت لہجے میں مجھ سے بات کر رہا تھا۔

''تھوڑی سی مہلت اور دے دیں۔'' میں نے منت کی۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' اعجاز نثار نے زور سے میز پر ہاتھ مارا۔ میرے ساتھ والی نشست پر بیٹھا عدی سہم کر پیچھے ہوا۔

''مگر اعجاز صاحب یہ اتنی بڑی رقم تو نہیں ہے عدی کی ٹانگ لگوائی ہے اور صرف سات ہزار تو تھی۔''

''سات ہزار تھی اب تک 35 ہزار بن چکی ہے۔'' وہ بے نیازی سے بولا اور میرے قدموں تلے زمین سرک گئی تھی۔

عدی اب اپنے ہاتھ میں پکڑی دس روپے والی اس سم سم بال سے کھیل رہا تھا، جو میں نے راستے میں اسے خرید کر دی تھی۔ وہ کبھی سم سم کو دائیں ہاتھ سے بائیں میں اچھالتا اور واپس منتقل کرتا اور کبھی اوپر نیچے کی جانب اچھال کر خوش ہوتا۔

''کیوں حرام سود کھاتے ہیں آپ لوگ؟'' میں پھٹ پڑی تھی۔

''اسی حرام سود پر قرضہ لیا تھا آپ نے بی بی!''

''میں کہاں سے لاؤں پیسہ؟'' مجھے لگا اگر میں نے کچھ اور ضبط کیا تو شاید حواس کھو دوں۔

''یہ آپ کا مسئلہ ہے۔''

''پینتالیس سالہ بدشکل اعجاز نثار کے لہجے میں تمسخر تھا۔

میں شکست خوردہ قدموں سے واپس آ گئی۔

اٹھائیں تاریخ میں دو دن باقی تھے۔ میرا دماغ سوچ سوچ کر سن ہو رہا تھا۔ مجھے یاد آیا رقم میرے پاس ختم ہونے کو تھی۔ میں تین ہزار کی قسطیں کہاں سے دوں گی؟

اس معاملے پر میں جتنا سوچتی، دماغ اتنا الجھ جاتا۔ پتا نہیں کس طرح میں الجھا ہوا دماغ لے کر عدی کے ہمراہ گھر تک پہنچی۔

عصر کی اذانیں ہو رہی تھیں، جب عدی کو سوتا چھوڑ کر بستر سے اٹھی۔ وضو کر کے نماز پڑھی۔ دماغ اتنا بری طرح الجھا ہوا تھا کہ آنسو بہہ ہی نہ سکے۔

پتا نہیں میرا کیا قصور تھا جس کی سزا میں پچھلے ایک برس سے کاٹ رہی تھی۔ وہ ایک آزمائش تھی جس میں صبر اور ہمت سے مجھے اترنا تھا مگر نہیں۔ عدی کو تو میں نے کبھی آزمائش بھی نہیں سمجھا تھا۔ وہ میرا بیٹا تھا، میرے جسم کا ٹکڑا، میری محبت، میری زندگی، وہ مجھے بہت پیارا تھا اور شاید اس دنیا میں، میں وہ واحد انسان تھی، جسے عدی پیارا تھا، جسے عدی کی فکر تھی۔

ہر دوسرے شخص نے عدی کے ساتھ ہمدردی تو کی تھی مگر اسے کبھی نارمل انسان کا درجہ نہیں دیا تھا۔ مختلف اسکولوں کی انتظامیہ ہو، یا مس ناز، بس اسٹاپ کے قریب گراؤنڈ میں کھیلنے والے بچے ہوں یا اعجاز نثار جیسے سود خور۔ سب عدی کو معاشرے پر ایک بوجھ سمجھتے تھے، کسی نے آج تک نہیں کہا تھا کہ عدی بھی محبت کے لائق ہے۔ مجھے لگتا تھا یہ لوگ عدی کو ایب نارمل بنا ڈالیں گے۔ اس دنیا کے باشعور، عقل منداور بے پناہ ذہانت رکھنے والے باسیوں کے دل میں عدی جیسے کم ذہن بچے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ اگر عقل اور دانش یہی سکھاتی ہے تو میرا عدی ان بے حس لوگوں سے بہت بہتر تھا۔

پچھلے ایک برس سے میں نے جس طرح گزارا کیا تھا، وہ میں جانتی تھی یا میرا اللہ، مگر پچھلے ایک سال میں اتنی پریشان تو میں کبھی بھی نہیں ہوئی تھی جتنی آج تھی۔

میرے اسکول نے مجھے قرضہ نہ دیا، جتنی ٹیچرز سے میری سلام دعا تھی، میں نے سب کے آگے ہاتھ پھیلایا مگر کسی نے مدد نہ کی۔ کبھی میں سوچتی تھی کہ مر جاؤں گی مگر کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاؤں گی لیکن آج قرض کے لیے ہی سہی، میں جھولی پھیلا رہی تھی۔ اولاد انسان کو بہت مجبور کر دیتی ہے۔

اور جب اعجاز نثار نے یہ کہا کہ اسے آج ہر قیمت پر دس ہزار روپے چاہئیں تو میرے اندر پچھلے ایک برس سے ابلنے والا لاوا پھٹ پڑا تھا۔

''میرے پاس بیچنے کو سونا ہے، نہ کوئی قیمتی سامان، خود کو بیچوں یا اپنے بچے کو۔ کوئی تو انصاف کرے۔'' میرا سانس اتھل پتھل ہو رہا تھا۔ ''کیا اس ملک میں کوئی عادل نہیں ہے جو مجھے انصاف دے؟ میرا بچہ معذور ہے، میں اس کی ضرورتیں پوری کروں یا آپ کا سود اتاروں؟ اتنا تو قرضہ اتار چکی ہوں، مگر پھر بھی آپ کے سات ہزار ختم نہیں ہوتے؟ اب کیا کروں میں، آپ بتائیں مجھے؟''

عدی نے یک دم سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر میرا بازو ہلایا۔ ''ماما۔ ماما! میں عادل'' اس نے میری عادل والی بات پر ردعمل ظاہر کیا تھا۔ اس کا خیال تھا میں اس کا نام لے رہی ہوں۔

''چپ کرو عدی!'' میں نے ڈپٹ کر اسے خاموش کرا دیا۔

اعجاز نثار نے ایک ناپسندیدہ نگاہ عدی پر ڈالی۔

''کر تو تم بہت کچھ سکتی ہو۔'' اس کی گہری نگاہیں مجھے اپنے جسم کے پار ہوتی محسوس ہوئیں۔ میں نے خوف زدہ سی ہو کر اپنی سیاہ چادر پیشانی پر اور بھی سختی سے لپیٹ لی۔

''حد میں رہ کر بات کریں آپ۔'' وہ جو قدرے آگے کو جھکا ہوا تھا، یک دم بے مزہ سا ہو کر واپس سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''بی بی! پیسے تو جمع کرواؤ، ورنہ میں پولیس کو بلواتا ہوں۔

''پولیس؟'' میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ''میں نے...... میں نے کیا کیا ہے؟ کس کو قتل کیا ہے؟''

''پیسے لائی ہو یا نہیں؟'' اس کے لہجے کی کرختگی مجھ ڈرا رہی ہے۔

''میں نے کون سے خزانے لوٹ لیے ہیں، ہاں؟ آپ مجھے پولیس کے حوالے نہیں کر سکتے۔ یہ ایک شہری کے بنیادی حقوق کے خلاف ہے۔''

''کون سے بنیادی حقوق؟'' میری آنکھوں کے آگے ہاتھ نچا کر وہ تمسخر سے ہنسا۔ ''ملک میں مارشل لاء لگا ہوا ہے، وزیر اعظم تو سات آٹھ ماہ پہلے ہی جیل جا چکا ہے۔ اتنے بڑے لوگ جیل جا سکتے ہیں تو تم کیا چیز ہو؟''

میرا منہ حیرت اور خوف کے عالم میں پورا کھل گیا۔ عدی نے اس کے لہجے سے خوف زدہ ہو کر میرا ہاتھ سختی سے پکڑ لیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی میرے سر پر ہتھوڑے برساتے ہوئے مجھے زمین کے اندر دھکیل رہا ہے۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر میں نے اپنے حواس کو مجتمع کرتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اندر داخل ہونے والے دو باوردی پولیس افسران اور ایک لیڈی کانسٹیبل کو دیکھ کر میرے رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے۔ میں نے گھبرا کر اعجاز نثار کو دیکھا۔

''مم میں واپس کر دوں گی پیسے۔'' میرے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکل رہی تھی۔

''سر! اس عورت نے پچھلے پانچ ماہ سے تنگ کر رکھا ہے۔ ہماری رقم واپس نہیں کر رہی۔ آپ ذرا اس سے ہماری رقم تو نکلوا دیں۔'' میرے سامنے تلخ لہجے میں بات کرنے والے اعجاز نثار کی آواز میں یک دم شیرینی گھل گئی تھی۔

''کیوں بی بی؟ شریف لوگوں کے پیسے کھانے کا کیا شوق ہے تمہیں ہاں؟'' بل کھاتی مونچھوں پر عادتاً ہاتھ پھیرتے ہوئے انسپکٹر بولا۔

خوف کی ایک لہر نے میرے پورے وجود کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

''مم میں نے کسی کے پیسے نہیں کھائے۔ خدارا! میرا یقین کرو۔ میں ایک معمولی ٹیچر ہوں، میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ میرا بچہ بیمار ہے۔'' میں نے روتے ہوئے ان کے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔

انسپکٹر نے لیڈی کانسٹیبل کو اشارہ کیا، اس نے جھٹ آگے بڑھ کر میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگا دی۔

''میں نے کیا کیا ہے؟ کتنے ارب روپے قرضے کی نادہندہ ہوں؟'' میں چیخ رہی تھی، چلا رہی تھی، مگر وہ میری نہیں سن رہے تھے۔

عدی نے میرے بازو کو سختی سے پکڑ لیا۔ جس وقت وہ مجھے کمرے سے لے جا رہے تھے مجھے اچانک یاد آیا عدی کا ان ہیلر اعجاز نثار کی میز پر رہ گیا تھا وہ میرے پرس میں تھا اور پرس میں نے بے دھیانی میں میز پر رکھا تھا۔

''میرا پرس مجھے لینے دو۔ اس میں میرے بیٹے کا ان ہیلر ہے۔ تمہیں اللہ کا واسطہ، رسولؐ کا واسطہ۔'' میں اپنے ہتھکڑیوں والے ہاتھ ان کے سامنے جوڑنے لگی۔

''تنگ مت کرو۔ خاموش رہو۔'' نہایت اکتاہٹ سے اس بھاری بھرکم لیڈی کانسٹیبل نے مجھے جھڑکا۔

''خدا کے لیے مجھے.....''

مجھے فقرہ مکمل کرنے کی مہلت نہ ملی۔ لیڈی کانسٹیبل کا زناٹے دار تھپڑ میرے منہ پر لگا تھا۔
انہوں نے مجھے ایک فون کال کرنے کی بھی مہلت نہ دی تھی۔

✡......✡......✡

جعفر آباد جیل جتنی خوفناک تھی، اس میں کٹنے والا وقت اس سے بھی زیادہ خوف ناک تھا۔

جس سیل میں مجھے عدی کے ساتھ بند کیا گیا تھا، وہ میرے جیسی جون کے مہینے میں جعفر آباد کے 52 ڈگری سینٹی گریڈ درجہ حرارت میں محض پنکھے میں گزارہ کر لینے والی عورت کے لیے بھی جہنم سے کم نہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے زمین آگ اگل رہی ہے اور چھت آگ برسا رہی ہے۔ زمین سے اس ٹین کی چھت کا فاصلہ محض ساڑھے آٹھ فٹ تھا، جس سے حبس اور گھٹن میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

جس لمحے میں اور عدی اس کال کوٹھڑی میں داخل ہوئے، مجھے وہ تمام اذیت، ذلت اور تضحیک بھول گئی جو محسوس ہوئی تھی۔ روحانی ذلت اور اذیت اس جسمانی اذیت سے بڑھ کر ہرگز نہ تھی۔

''ماما! گرمی ہے۔'' عدی بے چین ہو کر بولا۔ اسے پل بھر میں ہی پسینہ آ گیا تھا۔

''میرا جرم کیا ہے؟'' دروازے کی سیاہ، گرم لوہے کی سلاخیں پکڑ کر میں چلائی۔ لوہے کی گرم گرمائش کے باعث میرے ہاتھ سرخ ہو کر جلنے لگے تھے۔

دور بیٹھے سپاہی نے سر اٹھا کر بھی میری جانب نہ دیکھا۔

''میں نے کون سا جرم کیا ہے؟ صرف۔ صرف اس لیے کہ وہ حرام خور تمہارے انسپکٹر کا دوست تھا، تم لوگ مجھے اور میرے بچے کو پکڑ کر ادھر لے آئے ہو۔ خدا کے لیے ہمیں جانے دو، میرا بچہ بیمار ہے۔''

لوگ کہتے تھے، عدی پاگل ہے، اس وقت مجھے لگ رہا تھا کہ عدی نہیں بلکہ میں پاگل ہوں۔ میں زور زور سے ہسٹریائی انداز میں چلا رہی تھی مگر وہاں کوئی ٹس سے مس نہ ہوا، نہ کوئی سپاہی، نہ ہی کوئی قیدی، شاید وہ لوگ اس منظر نامے کے عادی تھے۔

''کھولو یہ لاک اپ۔'' میں سلاخوں کو پکڑ کر زور زور سے ہلانے لگی۔ ''میرا بیٹا بیمار ہے، اس کا ان ہیلر باہر رہ گیا ہے۔'' میری پوری کمر پسینے سے بھیگ چکی تھی، سر کے بال چپک کر رہ گئے تھے، حلق میں کانٹے سے اگ آئے تھے۔ مجھے لگا، میں دوزخ میں پھینک دی گئی ہوں۔

''میرے بیٹے نے کیا بگاڑا ہے تم لوگوں کا؟ کس بات کی سزا دے رہے ہو اسے تم؟'' میں پاگلوں کی

طرح چیخ رہی تھی۔ میرے ذہن میں اس وقت صرف ایک بات تھی کہ عدی کا ان ہیلر اعجاز نثار کی میز پر رہ گیا ہے۔ اگر عدی کو ''استھما اٹیک'' ہو گیا تو میں کیا کروں گی؟ اس سے آگے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ استھما اٹیک میں ان ہیلر نہ ملنے پر عدی کے پاس صرف چند سیکنڈ......

میں نے تڑپ کر عدی کو دیکھا۔

مجھے پولیس آفیسر کے الفاظ یاد آئے جو اس نے مجھے اس کوٹھڑی میں بند کرتے وقت کہے تھے۔

''چار دن جیل میں رہو گی تو دماغ ٹھکانے آ جائے گا۔''

''چار دن؟'' میں نے دہل کر سوچا۔ عدی کے پاس کبھی چار دن نہیں ہوں گے۔ استھما اٹیک کی صورت میں اس کے پاس صرف چار منٹ ہوں گے۔

''میرے اللہ!'' میں نے بے اختیار اوپر ٹین کی چھت کو دیکھا۔ ''میں کدھر جاؤں؟ مجھ پر رحم کر، میرے ساتھ عدل کر۔''

مگر جعفر آباد جیل کی اس ابلتے، تپتے صحرا کی مانند کوٹھڑی میں کوئی عادل کوئی منصف نہ تھا۔

عدی کو ساتھ لگائے میں کتنی ہی دیر روتی رہی۔

''عدی۔! دعا کرو اللہ ہم پر رحم کرے، ہمارے ساتھ عدل کرے۔''

''عادل، ماما؟ میں عادل عدی...... عادل ہے۔'' اس نے جوش سے اپنا نام لیا۔

''نہیں عدی! تم نہیں تم بس دعا کرو۔'' میں نے ہولے سے اسے کا گال تھپتھپایا۔ چند لمحے تک تو وہ مجھے دیکھتا رہا، پھر دیوار سے کمر لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں اپنے ہاتھوں پر مرکوز تھیں۔ جانے وہ دعا کر رہا تھا یا صرف اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔

''میرے اللہ! میں کہاں جاؤں۔'' شام گہری ہو رہی تھی۔

عدی کو استھما اٹیک کبھی دن میں چھ دفعہ ہوتا تو کبھی ایک دفعہ بھی نہیں۔ میں نے بہت دعا کی کہ کم از کم آج کی رات تو اسے اٹیک نہ ہو۔

وہ کافی دیر تک خاموشی سے اپنے ہاتھوں کو دیکھتا رہا، پھر اس نے جیب سے سم سم نکالی اور اس سے کھیلنے لگا۔

ساڑھے آٹھ فٹ اونچائی والی اس کوٹھڑی کی دیواریں بے حد سادہ تھیں۔ جگہ جگہ سے پلستر اکھڑا ہوا

تھا، کہیں کہیں فحش فقرات لکھے ہوئے تھے۔ پتا نہیں وہاں کس قسم کے لوگ آتے تھے۔

''تمہارا اپنا بچہ ہوتا تو بھی تم خاموش بیٹھے رہتے؟'' میرے ایک دفعہ پھر چلانے پر بھی ان پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

رات ایک پہر بیت چکی تھی، جب مجھے احساس ہوا کہ وہاں سب بہرے ہیں، احساس کی سماعت سے محروم ہیں۔ لہٰذا میرے چلانے سے ان کا کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

میں ہمت ہار کر اس جگہ جگہ سے اکھڑے فرش پر بیٹھ گئی۔

عدی کا پورا جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا، میں اپنے بوسیدہ دوپٹے سے اس پر پنکھا جھلنے لگی۔

ساری رات خوف کے عالم پر میں عدی پر سورتیں پڑھ پڑھ کر پھونکتی رہی، کہ اس کا استھمانہ بگڑے، اسے اٹیک نہ ہو۔ جب بھی وہ ہلکی سی کروٹ لیتا، میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ جاتا۔ کتنی ہی بار میں گھبراہٹ سے اس کے چہرے کا رنگ، اس کے تنفس کی رفتار دیکھتی۔ جب یہ یقین ہو جاتا کہ وہ ٹھیک ہے تب ہی مجھے قدرے سکون آتا۔

پوری رات روتے اور عدی کے لیے دعائیں کرتے گزری، صبح جب وہ اٹھا تو ٹھیک تھا۔

''ماما! گرمی'' اس نے بے زاری سے کہا۔ میں نے اس کی شرٹ اتار دی اور اسے دوپٹے سے ہوا دینے لگی۔

صبح کے آٹھ بجے ہوں گے مگر سورج اپنے جوبن پر چمک رہا تھا۔ آسمان قہر کی طرح گرمی برسا رہا تھا۔ آگ کے گولے تھے جو میرے جسم پر گر رہے تھے۔

عدی نے دیوار سے ٹیک لگا لی، میں اس پر پنکھا جھلتی رہی۔ پھر وہ یکدم کھڑا ہو گیا اور قدرے بے چینی سے اس کوٹھڑی میں دو چار قدم چلا، پھر واپس میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''عدی! کیا ہوا ہے؟'' دور کہیں میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں تواتر سے بجنے لگی تھیں۔

''ماما!'' اس کا ہاتھ اپنی گردن پر تھا۔ ''ماما...... ان ہیلر''

''نہیں...... نہیں......'' بے اختیار اپنی چیخ روکنے کے لیے میں نے منہ پر ہاتھ رکھا۔ ''میرے اللہ! نہیں۔''

عدی وہیں زمین پر لیٹ گیا، اس کا ہاتھ اب اپنے سینے کو مسل رہا تھا۔ اس کے سینے سے وہی جانی

پہچانی ''خرخر'' کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔

''ماما'' وہ کراہا۔ اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔ یہ گرمی والا پسینہ نہیں تھا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اسے آکسیجن نہیں مل رہی۔

اس کی رنگت بتدریج زرد پڑتی جا رہی تھی۔

''ماما!'' میرا بیٹا مجھے پکار رہا تھا، میں ساکت بیٹھی اس کو دیکھ رہی تھی۔

اس کے ناخنوں اور ہونٹوں کا رنگ بدل رہا تھا، آہستہ آہستہ وہ نیلے پڑ رہے تھے۔ میرا خون منجمد ہو رہا تھا۔ میں بت بنی اپنے بیٹے کو مرتے دیکھ رہی تھی۔

اس کی پسلیوں کے درمیان جلد کھنچ رہی تھی، مجھے لگا کوئی میری جلد کھینچ رہا ہے۔

''ماما۔ ان ہیلر۔'' وہ سخت تکلیف میں تھا۔

''عدی......'' میں نے اس کے ہاتھ تھام لئے۔

''عدی...... میرے بچے!'' الفاظ جیسے ختم ہو کر رہ گئے تھے۔

جب عدی پیدا ہوا تھا تو اتنی ڈھیر ساری معذوریوں کے باعث لوگ کہتے تھے۔ یہ بچہ جلد ہی مر جائے گا لیکن میں کہتی تھی ''نہیں...... عدی زندہ رہے گا۔ عدی سو سال جئے گا۔''

مگر جعفر آباد جیل کی اس تپتی دوپہر میں پہلی دفعہ مجھے لگا، عدی زندہ نہیں رہے گا۔ پہلی دفعہ مجھے لگا، میرا بیٹا میرے ہاتھوں میں دم توڑ دے گا۔

''ماما۔!'' وہ اذیت میں مبتلا مجھے پکار رہا تھا، اور میں بے بسی کی تصویر بنے اس کو مرتے دیکھ رہی تھی۔

''اس کا علاج کیوں نہیں کراتے؟ اس کا زخم خراب ہو رہا تھا۔'' ایک اجنبی آواز نے ماحول پر چھایا سکوت توڑا تھا۔ مجھے پروا نہیں تھی، میری نگاہیں عدی پر تھیں۔ اس کے لب نیلے پڑ رہے تھے۔ باہر کوئی جواباً کچھ کہہ رہا تھا۔

''سکیورٹی پرابلم ہے۔ اس کو کوئٹہ نہیں لے جا سکتے اور ویسے بھی یہ صرف چند دن......''

''شٹ اپ......'' کوئی زور سے دھاڑا تھا۔ ''تم لوگ اسے انسان نہیں سمجھتے؟ کل کو تم نے مرنا نہیں ہے۔؟ اللہ کو منہ نہیں دکھانا؟''

مجھے باہر صحن میں موجود اس غضب ناک ہوتے اجنبی پر ہنسی بھی آئی تھی اور رونا بھی۔ وہ جانوروں کو

انسانیت کا درس دے رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس جیل کے پورے عملے نے مرنا نہیں تھا۔ وہ سب خدا تھے، انہوں نے کسی کو قبر میں نہیں جانا تھا۔ مرنا تو صرف عدی اور عدی کی ماں کو تھا۔

باہر موجود شور اب بلند ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اجنبی کسی پر برس رہا تھا۔

میں نے عدی کی نبض کو ہاتھ میں لیا۔ اس کی نبض کی رفتار ہر گزرتے لمحے ایب نارمل ہوتی جا رہی تھی۔ میرے دل کو کچھ ہوا۔ یوں لگتا تھا، کوئی آہستہ آہستہ مجھے برچھیوں سے ذبح کر رہا ہے۔

عدی! میری جان، میرا بیٹا میرے سامنے تڑپ رہا تھا مگر کوئی اس کی مدد کو نہیں آ رہا تھا۔

''کھولو یہ تالا۔'' کوئی میری کوٹھڑی کے قریب آ کر حکمیہ لہجے میں بولا۔

میں نے سر نہیں اٹھایا، میں اپنے بچے کو اس کے آخری سانس تک دیکھتی رہنا چاہتی تھی۔ میری اب جیل کے عملے سے امیدیں ختم ہو چکی تھیں۔

''اس کو پکڑ کیوں رکھا ہے؟'' وہی اجنبی آواز کسی سے پوچھ رہی تھی۔

عدی ایک دم کھانسنے لگا۔ یہ آخری نشانی تھی اب بھی اس کو ان ہیلر نہ ملتا تو وہ مر جاتا۔

ایک پولیس افسر میرے متعلق اس شخص کو کچھ بتا رہا تھا، جب عدی کی کھانسی دیکھ کر وہ چونکا۔ ''اس بچے کو کیا ہوا ہے؟''

میں نے سر اٹھا کر پہلی بار اسے دیکھا۔ ''استھما کا اٹیک ہوا ہے، یہ اس کو دوائی نہیں دے رہے۔'' میں بھی کسی سے شکایت کر رہی تھی، وہ بھی غالباً جیل کا کوئی اور آفیسر تھا، باقیوں کی طرح بے حس اور خود غرض۔

''استھما اٹیک ہوا ہے؟'' وہ یکدم باوردی پولیس آفیسر جس کے کندھے پر تلوار بنی تھی، کی جانب مڑا۔ ''یہاں فوراً'' فرسٹ ایڈ بھجواؤ کدھر ہے جیل کا ڈاکٹر؟ بچے کو استھما اٹیک ہے اور تم لوگ آرام سے بیٹھے ہو۔'' اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی دو اہل کار برق رفتاری سے باہر کی جانب بھاگے تھے۔

کوئی میرے وجود میں نئی روح پھونک رہا تھا۔ میں نے نیم جاں ہوتی امید کو سہارا دیا۔

''کس منہ سے جاؤ گے اللہ کے پاس تم لوگ؟'' وہ ایک دفعہ پھر شروع ہو گیا تھا۔

ان ہی دو اہل کاروں کے ساتھ جیل کا ڈاکٹر بھاگا بھاگا اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ان ہیلر تھا۔ اس نے باری باری عدی کو دوائی کے چار پف دیے۔ عدی کی بگڑی حالت قدرے سنبھلی، اس کے چہرے کی رنگت واپس آنا شروع ہو گئی۔ آہستہ آہستہ ناخنوں اور ہونٹوں کی نیلاہٹ، سرخی میں بدل گئی اس کا تنفس اور

نبض، دونوں بحال ہو چکے تھے۔

میں نے ایک دکھ بھری نگاہ ڈاکٹر پر ڈالی۔ جب میں چیخ رہی تھی، چلا رہی تھی تو وہ نہیں آیا تھا اور اب اس شخص کے حکم سے فوراً آ گیا تھا۔

پہلی دفعہ میں نے کوٹھڑی میں کھڑے افراد کی جانب دیکھا۔ آدھے تو ان میں جیل کے افسران تھے، ایک کے کندھے پر ''تلوار'' بنی تھی، یقیناً وہ آئی جی بلوچستان تھا۔ ڈی آئی جی بھی ساتھ ہی تھا۔

ان سب میں سادہ کپڑوں والا صرف وہی تھا جس کے حکم پر ڈاکٹر نے میرے بیٹے کو ان ہیلر دیا تھا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا۔

وہ دراز قد، صاف رنگت اور بڑی آنکھوں والا خوب صورت، وجیہہ اور باوقار مرد سیاہ سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس شخص میں ضرور کوئی ایسی بات تھی کہ انتہائی بدلحاظ اور ظالم جیل انتظامیہ اس کے سامنے میمنوں کی طرح کھڑی گھگھیا رہی تھی۔

''اس عورت کو جیل میں کیوں رکھا ہے، اس کا جرم کیا ہے؟ اگر اس کا کوئی جرم ہے تو عدالت میں پیش کرو، مجھے پوری رپورٹ چاہیے کہ اس کی حالت کیسی ہے۔ اگر یہ بچہ مر گیا تو یاد رکھنا آئی جی! میں تم سے لے کر اس جیل کا پورا عملہ معطل کروا کر اسی جیل میں ڈال دوں گا۔ اگر اس بچے کو کچھ ہو گیا تو مجھے ساری رات نیند نہیں آئے گی۔ خدا کے قہر سے نہیں ڈرتے تم لوگ، انسانوں کو جانوروں کی طرح رکھا ہوا ہے۔''

وہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا مگر مجھے اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میرا دماغ سوچوں کے بھنور میں پھنسا ہوا تھا۔

یہ کون تھا؟ یہ کیوں میرے بیٹے کے لیے انتظامیہ پر برس رہا تھا؟ میں نے تو اس سے عدی کے علاج یا زندگی کے لیے کوئی منت سماجت نہیں کی تھی، عدی میرا بیٹا تھا، آج تک کسی نے اس کی پروا نہیں کی تھی اور اب، ایک اجنبی آ کر یہ کہہ رہا تھا کہ اگر عدی کو کچھ ہو گیا تو اس کو ساری رات نیند نہیں آئے گی؟ کیا ایک معذور، ایب نارمل اور بیمار بچہ اتنا اہم تھا کہ اس بارسوخ اور پروقار انسان کو اس کی وجہ سے نیند نہیں آئے گی؟

لوگ تو کہتے تھے، عدی مرتا ہے تو مر جائے۔ عدی کی ماں تھی جو ساری زندگی عدی کے لیے لڑی تھی، ساری عمر اسی کوشش میں گزار دی کہ کوئی تو عدی سے محبت کرے، اسے ''انسان'' خیال کرے اور آج ایک انجان شخص جس کو میں نے عدی کی ذہنی حالت کے متعلق کوئی وضاحتیں نہیں دی تھیں، عدی کی پروا کر رہا تھا۔ اس

کے علاج کے لیے جیل انتظامیہ اور بلوچستان کے اعلیٰ ترین پولیس افسران کو ڈانٹ رہا تھا؟ وہ کون تھا؟ کون سی طاقت اس شخص کے پاس تھی جو وہ اعلیٰ عہدیداران ان کے سامنے ہاتھ باندھے، سر جھکائے کھڑے تھے؟

دو پولیس اہلکار عدی کو باہر لے جانے لگے تو میں بھی ان کے ہمراہ ہو لی۔ پتا نہیں کیوں میں شکریے کا ایک لفظ بھی اس آدمی سے نہ کہہ سکی جو میرے بیٹے کے لیے فرشتہ بن کر آیا تھا۔ اس شخص میں کوئی ایسا رعب و دبدبہ تھا کہ اس کے سامنے بولنے کی ہمت میں خود میں نہیں پاتی تھی۔

صحن کا احاطہ عبور کر لینے کے بعد میں نے ایک نظر گردن پھیر کر اس شخص پر ضرور ڈالی تھی۔

وہ ابھی تک ان افسران پر برس رہا تھا۔

''ماما......!'' عدی نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے پکارا۔ اس کے انداز میں خوف تھا۔ میں جانتی تھی وہ جیل کے تجربے سے ڈر گیا ہے۔ حالانکہ اب پولیس ہمیں چھوڑ چکی تھی اور اس شخص کے کہنے پر عدی کو کوئٹہ کے بہترین اسپتال میں شفٹ بھی کیا جاچکا تھا، مگر پھر بھی عدی سراسیمہ تھا۔

''عدی......میری جان! گندے لوگ اب نہیں آئی گے۔ ڈرو مت۔'' میں نے اس کے گال پر پیار کرتے ہوئے نرمی سے بتایا، میں اس کا ڈر ختم کرنا چاہتی تھی۔

''ماما! اب تو وہ نہیں پکڑیں گے؟'' اس نے معصومیت سے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں بیٹا! وہ جو بندہ تھا نا، اب وہ ان کو ہمیں نہیں پکڑنے دے گا۔'' میں نے پیار سے سمجھایا تھا۔

''ماما! وہ کون تھا؟'' عدی کی آنکھوں کے سامنے یقیناً اس کی تصویر گھوم رہی تھی، میں سمجھ گئی۔ عدی کو چہرے یاد رہتے تھے۔

''بس عدی! ایک اچھا بندہ تھا۔'' اس کے بھورے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے میں نے ہولے سے کہا تھا۔ ''ایک عادل۔''

''عادل تھا؟ عدی عدی ہے ماما......عدی......عادل۔'' وہ اپنی ہی زبان میں اپنا نام دہرا رہا تھا۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا، پھر اس کے ماتھے پر آئے بال ہٹائے۔

''ہاں، عدی عادل ہے۔''

یہ کہتے ہوئے میرا دماغ ایک دفعہ پھر جعفر آباد جیل پہنچ گیا تھا۔

۞......۞......۞

''ماما......! طوطا لینا ہے۔'' فٹ پاتھ پر میرے ساتھ چلتے ہوئے عدی نے ایک دم کہا۔ وہ اپنے سے فاصلے پر ایک فال نکالنے والے کے طوطے کو دیکھ کر کہہ رہا تھا۔

''بیٹا! طوطا استھما خراب کرتا ہے۔'' ہمیشہ کی طرح میں نے سمجھانا چاہا۔ میری بات پر وہ خاموش ہو گیا، مگر اس کی نگاہیں طوطے پر تھیں۔ جب ہم فال والے نجومی کو کراس کر کے آگے بڑھ گئے، تب بھی وہ مڑ مڑ کر حسرت سے طوطے کو دیکھتا رہا۔

اس کے یوں دیکھنے سے مجھے افسوس ہوا تھا۔ مگر میں کیا کر سکتی تھی۔ عدی کو طوطا لینے سے روک سکتی تھی، طوطا دیکھنے سے تو نہیں منع کر سکتی تھی۔

جب طوطا نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو وہ تھک کر آگے دیکھتے ہوئے قدم اٹھانے لگا۔ وہ بہت چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا تھا، اس لیے مجھے بھی آہستہ چلنا پڑتا تھا۔

میں نے ایک نظر اس کی پینٹ سے ڈھکی مصنوعی ٹانگ پر ڈالی۔ یہ ٹانگ میں نے دو برس پہلے ایک خیراتی ادارے سے لگوائی تھی، مگر پتا نہیں کیوں، جب بھی میں عدی کی مصنوعی ٹانگ کو دیکھتی، مجھے وہ بھدی، لکڑی کی ٹانگ یاد آ جاتی جس کی وجہ سے ہمیں جعفر آباد جیل جانا پڑا تھا۔

جعفر آباد جیل سے رہا ہوئے ہمیں کتنے سال ہو گئے تھے؟ میں نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

''سات یا پونے سات برس۔'' مگر ان سات برسوں میں وہ تنگ اور گھٹن بھری کوٹھڑی مجھے نہیں بھولی تھی۔ وہ خوف ناک رات، پر اذیت گرمی، اور عدی کی زندگی کا بدترین استھما اٹیک، مجھے کچھ بھی نہیں بھولا تھا۔

اس جیل میں ایک رات گزارنے کے بعد میری نہ صرف نوکری چھٹی، بلکہ جعفر آباد بعد ازاں ہمیں چھوڑنا پڑا۔ جعفر آباد والا مکان چھوڑ کر اسلام آباد آ گئی تھی۔ یہاں ایک پرانی دوست سے مل کر میں نے دو کمروں کا فلیٹ لیا تھا۔ گزارے لائق ہی سہی مگر سر چھپانے کے لیے کافی تھا۔ شمائلہ کی وساطت سے مجھے نوکری اور عدی کو اسکول میں داخلہ مل گیا تھا۔ پچھلے سال شمائلہ کو اس کے شوہر نے قطر بلوا لیا تھا، وہ اپنا فلیٹ میرے حوالے کر کے جا چکی تھی۔

زندگی اب بھی ویسی ہی تھی۔ سات برسوں میں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ میری زندگی کا محور اب بھی میرا بیٹا عدی ہی تھا۔

عدی کی گروتھ بہت سست رفتاری سے ہو رہی تھی۔ ذہنی طور پر وہ اب بھی اپنے ہم عمر لڑکوں سے بہت

پیچھے تھا، اسے اب بھی لوگوں کے چہرے یاد ہو جاتے تھے، وہ فقرے بھی دہراتا تھا اور جب بچے اسے کھیل میں شامل نہیں کرتے تھے تو وہ روتے ہوئے میرے پاس آتا تھا۔

زندگی ویسی ہی تھی جیسی جعفر آباد میں ہوا کرتی تھی مگر اب وہ بے چینی و اضطراب میرے وجود سے ختم ہو گیا تھا۔ ایک عجیب سا سکون میری ذات کا حصہ بن گیا تھا۔ مجھے احساس ہوا تھا کہ ظلم اور بے انصافی پر کوئی آواز اٹھانے والا بھی ہے۔

''ماما...... کھلونا۔'' عدی نے ایک کھلونے والی دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے مچل کر کہا۔

''آؤ...... چلو کچھ لیتے ہیں۔'' چونکہ وہ مہینے کے اولین دن تھے اور میرے پاس کافی رقم تھی، اسی لیے میں اسے شاپ کے اندر لے آئی۔

''کیا لینا ہے؟'' اردگرد رکھے ڈھیروں کھلونوں کو دیکھ کر میں نے سوالیہ انداز میں عدی کی جانب دیکھا۔ اس نے فوراً سامنے رکھا ایک بھالو اٹھا لیا۔ اس کے ہاتھ سے بھالو لے کر میں نے قیمت پڑھی۔ ایک سو بیس روپے۔

ایک گہری سانس بھر کر میں نے پرس سے رقم نکالی، دکان دار کو تھمائی، بھالو لیا اور یوں ہم دونوں ''خوشی خوشی'' دکان سے باہر آ گئے۔

''میں نہیں پڑھنا۔'' شام کو جب میں عدی کو پڑھانے بیٹھی تو اس نے منہ بسور کر کہا۔ میں نے قدرے فکرمندی سے اسے دیکھا۔

''پڑھو گے نہیں تو بڑے کیسے ہو گے؟''

''مجھے پیسے دیں۔'' ایک دم چہرے پر معصومیت طاری کر کے فرمائش کرنے لگا۔ میں نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

''پیسے کیوں چاہئیں؟''

''مجھے قائداعظم لینا ہے۔'' وہ چہکا۔

''اوہ...... عدی......!'' میں نے گہری سانس لی۔ ''قائداعظمؒ بازار میں تو نہیں ملتے۔''

میری بات پر اس نے بھنویں سکیڑ کر کچھ دیر سوچا۔ ''پھر کہاں سے لوں؟''

''اوں ہوں۔'' میں بظاہر سوچنے لگی۔ ''قائداعظمؒ تو بنا جاتا ہے۔ جو بندہ بہت اچھا ہوتا ہے، وہ

قائداعظمؒ بنتا ہے۔''

''ماما......اچھا کیسے ہوتا ہے؟''

''عدی! یوں کہو کہ اچھا کیسے بنا جاتا ہے۔'' میں نے تصحیح کی۔ ''جب ہم کسی مشکل میں کسی کی ہیلپ کر تے ہیں تو اچھے بن جاتے ہیں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میرے دماغ کی رو بھٹک کر دور، بہت دور جعفرآباد جیل جا پہنچی تھی۔ ٹین کی نہایت جھکی ہوئی چھت کے نیچے کھڑا وہ باوقار، وجیہہ مرد جس کا جسم پسینے میں بھیگ چکا تھا مگر اسے پروا نہیں تھی، وہ ایک اجنبی معذور بچے کی مدد کرنے کے لیے بے چین ہو گیا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جو میرے بچے کی جان بچانے کا وسیلہ بنا تھا۔

اس شخص کو میں نے گزرے برسوں میں ہر روز یاد کیا تھا۔ ہر نماز میں اس کے لیے دعا کی تھی۔ پتا نہیں وہ کون تھا؟ انسان تھا یا فرشتہ۔ جانے وہ کہاں سے آیا تھا۔ اس کا نام کیا تھا، میں کچھ بھی تو نہیں جانتی تھی، اگر یاد تھا، تو بس اتنا کہ میرا محسن تھا۔ وہ مجھے بہت عزیز تھا۔

ہوتا ہے نا ایسے، بعض لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا مگر وہ آپ کی دعاؤں میں چپکے سے شامل ہو جاتے ہیں۔ ایسے کہ آپ کو خود بھی نہیں پتا چلتا اور آپ ان کے لیے دعا کرنے لگ جاتے ہیں۔ ایسا ہی ہوا تھا میرے ساتھ بھی۔

✡......✡......✡

''ماما...... ماما'' میں کمرے میں بیٹھی لیکچر کے لیے نوٹس تیار کر رہی تھی جب عدی مجھے پکارتا ہوا اندر کمرے میں آیا۔

''ماما...... عادل اچھا لگ رہا ہے نا؟'' وہ میرے قریب آ کر معصومیت سے بولا۔ میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور بے اختیار مسکرا دی۔

''جی، عادل بہت اچھا لگ رہا ہے۔''

وہ کچھ دیر تک الجھی ہوئی نظروں سے میری جانب دیکھتا رہا، پھر میرا بازو پکڑ کر ہلایا۔

''ماما۔ عادل اچھا لگ رہا ہے۔''

''عدی بیٹا، مجھے کام کرنے دو۔'' میں نے بازو چھڑوانا چاہا مگر وہ مجھے کرسی سے اٹھانے کی کوشش کر

رہا تھا۔

''ماما عادل۔ اچھا عادل۔''

میں نے کتاب بند کی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کمرے سے باہر چھوٹے سے لاؤنج میں لے آیا۔

لاؤنج کے عین وسط میں رکھے صوفے پر اس نے مجھے بٹھا دیا۔

''ماما...... عادل اچھا لگ رہا ہے۔'' وہ میرا ہاتھ پکڑے کہہ رہا تھا۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''ماما...... عادل کو دیکھو۔'' اس نے پھر اصرار کیا۔

''دیکھ تو رہی ہوں تمہیں۔'' مجھے اس تکرار سے اب کنفیوژن ہو رہی تھی۔

''میں نہیں ماما...... عادل......'' وہ جیسے مجھے کچھ سمجھانا چاہ رہا تھا۔

''عدی عادل نہیں ہے؟''

''نہیں ماما!'' اس نے میز پر رکھا اخبار میری گود میں رکھ دیا۔ ''یہ دیکھو۔''

میں نے قدرے الجھ کر اخبار کھولا۔ ہمارے گھر اخبار نہیں آتا تھا، یہ یقیناً میری ہمسائی ثمینہ کا اخبار تھا جو اکثر اخبار والا غلطی سے ہمارے گھر دے جاتا تھا۔

''کیا دیکھوں اس میں؟'' میں نے پہلے صفحہ پر نظر ڈالی۔

صفحے کے عین وسط میں ہیڈ لائن سے نیچے ایک تصویر تھی۔ عدی نے اس تصویر پر انگلی رکھ دی۔

میں نے ایک نظر اس تصویر پر ڈالی مگر ایک دم میرے لبوں سے چیخ نکلی۔ مجھے لگا پوری چھت میرے سر پر آن گری ہے۔

اس تصویر میں وہی تھا۔ وہی شخص جو جعفر آباد جیل میں میرے اور عدی کے لیے فرشتہ بن کر آیا تھا۔ وہ بالکل ویسا ہی لگ رہا تھا جیسا سن 2000 کے جون میں تھا۔ اس نے آج بھی سیاہ سوٹ پہن رکھا تھا۔

میں نے شاکڈ نظروں سے عدی کو دیکھا۔ اسے چہرے یاد رہتے تھے، میں جانتی تھی۔ اسے چہرے اتنی دیر تک یاد رہتے تھے، یہ میں نہیں جانتی تھی۔

''ماما......! عادل اچھا لگ رہا ہے نا؟'' عدی پوچھ رہا تھا۔

تو وہ اس کو عادل کہتا تھا، اور میں سمجھتی تھی، وہ اپنا نام لیتا ہے۔

میں نے ایک دفعہ پھر اس تصویر کو دیکھا۔ وہ وجیہہ، باوقار مرد ایک بڑے صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کے مقابل صوفے پر آمر وقت پورے تکبر سے براجمان تھا۔

میں نے قدرے حیرت سے انہیں دیکھا، اور پھر ہیڈ لائن پڑھی۔

''محتسب اعلیٰ معطل، اختیارات کے ناجائز استعمال کا ریفرنس دائر۔''

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

یہ...... یہ شخص میرا مسیحا، میری مدد کرنے والا اس ملک کا محتسب اعلیٰ تھا؟

مجھے یاد آ رہا تھا۔ پچھلے چند ماہ میں، میں نے اس کے متعلق ڈھیر ساری خبریں سنی تھیں۔ مجھے یاد آیا اس شخص نے کوڑیوں کے مول بیچی جانے والی اسٹیل مل کا فیصلہ دے کر کراچی کے 15 ہزار افراد کی نوکریاں بچائی تھیں۔

اس نے بسنت پر پابندی لگا کر سینکڑوں بچوں کی جانیں بچائی تھیں۔ مجھے میری ایک ساتھی ٹیچر نے بتایا تھا کہ جب بسنت کے رسیا باوردی سربراہ مملکت نے اس پابندی کے جواب میں نیا آرڈیننس پیش کیا تو اس قاضی وقت نے وہ آرڈیننس والا کاغذ اٹھا کر ایلچی کے منہ پر مارا تھا۔

''لوگوں کے بچے مرتے ہیں اور گالیاں ہمیں پڑتی ہیں۔''

میں نے اپنی ساتھی ٹیچرز سے، ہمسایوں سے اسکے متعلق بہت کچھ سنا تھا، مگر یہ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو میرے بچے کو اس اندھیری کوٹھڑی سے نکال لایا تھا۔ جس نے میرے بچے کی جان بچائی تھی۔

میں نے بڑی مشکل سے اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے اخبار دوبارہ پڑھا۔

''وہ گورنر کا پروٹوکول لیتے تھے۔ مرسڈیز استعمال کرتے تھے۔ نقاب پوش محافظ رکھتے تھے۔ ان کی گاڑی کے آگے اور پیچھے ایک ایک گاڑی محافظوں کی ہوتی تھی۔ انہوں نے سفر کے لیے حکومت کے ہیلی کاپٹرز استعمال کیے تھے۔'' میں نے بے حد حیرت سے اس خبر کو پڑھا۔

مجھے یاد آیا، ٹھیک دو ماہ پہلے عدی کا ان ہیلر ختم ہونے کے باعث میں رات کو کیمسٹ سے دوائی لینے گئی تھی۔ واپسی پر میں نے وزیر اعظم کی سواری دیکھی تھی۔ وہ منظر میرے ذہن پر نقش ہو گیا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ وزیر اعظم کی بلٹ پروف مرسڈیز کے آگے اور پیچھے کل پینتالیس سیاہ رنگ

کی مرسڈیز اور پیراڈو زتھیں۔ پینتالیس گاڑیوں کے علاوہ ایک فائر بریگیڈ اور چند ایمبولینس بھی اس قافلے کا حصہ تھیں اور یہ بتانا مشکل تھا کہ وزیراعظم کس گاڑی میں ہیں۔

اوراب، وہی وزیراعظم اس عادل وقت پر، جس کا عہدہ اور رتبہ اس سے بڑا تھا، یہ الزام عائد کر رہا تھا کہ وہ ''گاڑیاں'' رکھتا تھا۔

مجھے اس تپتی دوپہر میں ٹین کی چھت کے نیچے کھڑا وہ شخص یاد آ گیا، وہ شخص کسی کا حق نہیں مار سکتا تھا۔ کسی ناجائز کام کا حصہ نہیں بن سکتا تھا۔

وہ جو اس وقت ملک کی سب سے بڑی عدالت کا محتسب اعلا تھا۔ اس کو کیا پڑی تھی کہ آئی جی، ڈی آئی جی، اسسٹنٹ کمشنر وغیرہ تک کو اس جہنم کی مانند جیل میں گھسیٹ لائے اور قیدیوں کے مسائل سنے؟ وہ آرام سے گھر بیٹھ کر تنخواہ کھاتا رہتا، اس کا کیا جاتا تھا اگر ہزاروں عدی ان ہیلر نہ ملنے کے باعث جعفر آباد اور مچھ جیل جیسی دوزخوں میں مر بھی جاتے تو؟

مگر وہ شخص خوف خدا رکھتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے روز حشر اللہ کو حساب دینا ہے۔

اسی اخبار سے مجھے معلوم ہوا کہ اس شخص نے کل 26 ہزار مقدمات ان ایک سال اور آٹھ ماہ میں نمٹائے تھے۔ جن میں دس ہزار سوموٹو نوٹس تھے۔ وہ کیس لٹکانے سے منع کرتا تھا، بڑے بڑے سرکاری افسران اور وزراء کو عدالت میں بلا کر انہیں لتاڑتا تھا۔ وہ عام لوگوں کی صاف کاغذ پر کچی پنسل سے لکھی درخواست پر بھی فوراً ایکشن لیتا تھا۔ اس کی فیکس مشین پر ہر دوسرے منٹ درخواستیں آ رہی ہوتی تھیں۔ اس کے کولیگز اور اسٹاف کے مطابق وہ شخص مشین کی طرح کام کرتا تھا اور رات گئے تک آفس میں جتا رہتا تھا۔

مجھے تو بس اتنا یاد تھا کہ اس شخص نے میرے بچے کی جان بچائی تھی، اسے اللہ نے عدی کے لیے اس وقت فرشتہ بنا کر بھیجا تھا جب میری تمام امیدیں دم توڑ چکی تھیں۔

اس روز مجھے لگا تھا، اللہ ہے اور ابھی اللہ کی اس سرزمین پر عادل ختم نہیں ہوئے۔

اور آج......آج مجھے لگ رہا تھا کہ سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ حکمرانوں نے اس شخص کو بھی عوام سے دور کر دیا تھا جو اس روئے زمین پر انصاف کے حصول کے لیے ان کی آخری امید تھا۔ جو ایک مغویہ کے بازیاب نہ ہونے پر پورا کا پورا پولیس عملہ معطل کر دیتا تھا۔ جو عوام کو یہ یقین دلاتا رہا تھا کہ عدالتیں موجود ہیں، تم عدل کا دروازہ کھٹکھٹاؤ تو سہی۔

میں بے اختیار رونے لگی۔ سات سال بعد میرے دل میں وہ خوف پھر سے عود کر آیا تھا۔ میں نے سختی سے عدی کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ مجھے لگ رہا تھا ایک دفعہ پھر کوئی اعجاز نثار مجھے پولیس کے حوالے کر کے جعفر آباد جیل بھیج دے گا اور اس وقت جب عدی کے لب استھما اٹیک کے باعث نیلے پڑ رہے ہوں گے تو کوئی عادل اس ننھے قیدی کو چھڑانے نہیں آئے گا۔

✿......✿......✿

اس روز جب میں اور عدی اسکول سے واپس آ رہے تھے، تو مجھے راستے میں سڑک پر سفید کپڑوں اور سیاہ کوٹوں میں ملبوس مرد و خواتین پرامن احتجاجی مظاہرہ کرتے دکھائی دیے۔ انہوں نے ہاتھوں میں پلے کارڈ اٹھا رکھے تھے۔ عادل کے حق میں نعرے درج تھے۔ گھر جانے کے لیے رکشہ لینے کے بجائے میں عدی کی انگلی تھامے اس جم غفیر میں شامل ہو گئی۔

''ایک پلے کارڈ مجھے بھی دے دیں۔'' دو خاتون وکلاء کو جو آپس میں باتیں کرتے ہوئے چل رہی تھیں میں نے شائستگی سے مخاطب کیا۔ دونوں نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر دونوں نے ہی اپنے پلے کارڈز مجھے دے دیے۔

میں نے ایک عدی کو پکڑا دیا، اور دوسرا خود پکڑ لیا۔ ہم دونوں جلوس کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

''سنا ہے فل کورٹ بن رہا ہے۔'' میرے ساتھ موجود خاتون وکیل کہہ رہی تھی۔

''بس خدا کرے، بن ہی جائے۔ ورنہ وزیراعظم صاحب نے تو اسٹیل مل کیس کا بدلہ لیا ہے۔''

''اور نہیں تو کیا۔ پانچ گھنٹے محبوس رکھ کر استعفیٰ دلوانے کی کوشش کرتے رہے مگر وہ مردِ حق تو ڈٹ گیا کہ استعفیٰ نہیں دوں گا۔'' خاتون وکیل کے لہجے میں ستائش تھی۔

میں خاموشی سے ان کی باتیں سنتی رہی۔ مجھے کسی بات سے غرض نہ تھی۔ میں تو بس یہ چاہتی تھی کہ غریبوں اور بے کسوں کے زخموں کا علاج کرنے والا مسیحا اپنے منصب عدل پر ایک دفعہ پھر براجمان ہو جائے۔

اس روز کے بعد تو گویا معمول بن گیا۔ ہم روز کسی نہ کسی پرامن احتجاجی جلوس میں شامل ہو جاتے، آہستہ آہستہ جلوسوں کا حجم بڑھتا جا رہا تھا۔ وکلاء کے ساتھ ساتھ سول سوسائٹی بھی اس جم غفیر میں شامل ہوتی جا رہی تھی۔ لوگ نعرے لگاتے تھے۔ پھر پولیس سے لاٹھیاں کھاتے تھے اور اس کے بعد ایک دفعہ پھر نعرے

لگاتے تھے، پھر لاٹھی کھاتے تھے مگر رکتے نہیں تھے۔

میں نے بڑے بڑے لیڈروں کی ''ریلیوں'' میں ان پڑھ اور جاہل لوگوں کو نعرے لگاتے دیکھا تھا۔

اور میری ان ہی آنکھوں نے اس عادل کو ریلیوں میں انتہائی پڑھے لکھے لوگوں کو نعرے لگاتے اور پولیس کا تشدد سہتے دیکھا تھا۔

فل کورٹ بن گیا، بند کمرے کی پیشی کی تجویز کو مسترد کر دیا گیا اور یوں پوری دنیا کے سامنے عادل کے مقدمے کی سماعت ہونے لگی۔ ایک محتسب اعلا انصاف کے حصول کے لیے سرگرداں تھا۔

عوام کا ایک سمندر عادل کے ساتھ تھا۔ لاکھوں افراد اس کے ساتھ ہوتے۔

اس پر گورنر کا پروٹوکول لینے کا الزام تھا۔ میں نے لوگوں کو اسے شہنشاہ کا پروٹوکول دیتے دیکھا تھا۔

اس پر گاڑیاں استعمال کرنے کا الزام تھا۔ میں نے ہزاروں افراد کو اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر اس کی منتیں کرتے دیکھا کہ وہ ان کی گاڑی میں بیٹھ جائے۔ میں نے لوگوں کو اس کے قدموں میں اپنی پیراڈوز اور لینڈ کروزرز کی چابیاں گراتے دیکھا تھا۔

اس پر محافظ لینے کا الزام تھا، میں نے پوری قوم کو اس میر کارواں کا محافظ بنتے دیکھا تھا۔

لوگ اس سے صرف اس لیے محبت نہیں کرتے تھے کہ اس نے آمر وقت کے آگے جھکنے سے انکار کیا تھا۔ لوگ اس سے اس لیے محبت کرتے تھے کہ وہ غریب لوگوں کو انصاف دلواتا تھا، وہ عادل تھا۔

میری ایک ساتھی ٹیچر بتاتی تھیں کہ ان کی کزن کی دوست کو رشتے کے تنازعے پر گھر والوں نے زندہ جلا ڈالا تھا، ان کی کزن نے عادل کو خط لکھا، جس پر عادل نے فوری ایکشن لیتے ہوئے اس مقدمے میں ملوث ایک ایک شخص کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیجا تھا۔

سپریم کورٹ کے باہر احتجاج کرتے ہوئے ایک خاتون نے مجھے بتایا۔

''امجد میرا اکلوتا بیٹا تھا، مسجد میں اذان دیتا تھا۔ اس کی عمر صرف انیس برس تھی۔ ایک روز پکڑ کر غائب کر دیا گیا۔ اس بات کو چار سال بیت چکے مگر میرے بیٹے کا کچھ پتا نہیں چلا۔ میں نے ایک معمولی کاغذ پر کچی پنسل سے ایک درخواست لکھ کر بھیجی۔ ٹھیک تیسرے دن عادل نے میرے بیٹے کی گمشدگی کا نوٹس لیا۔ عادل نے انتظامیہ کو سات دن کے اندر اندر میرے بیٹے کو چھوڑنے کا حکم دیا تھا۔ اب مجھے بتاؤ، میں کس کے پاس جاؤں؟ میرا بیٹا کون مجھے لا کر دے گا؟''

وہ عورت کہتے کہتے رو پڑی تھی عادل معطل نہیں ہوا تھا، بلکہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ان سینکڑوں لاپتہ شہریوں کے گھر والوں کی امیدیں ٹوٹ گئی تھیں۔

اب مائیں اپنے عدی کو ڈھونڈنے کس کے پاس جائیں گی؟ کس در کو کھٹکھٹائیں گی؟

۞......۞......۞

اپنے محدود وسائل اور کم آمدنی کے باوجود میں عادل کے کارواں کے ساتھ فیصل آباد اور پھر خانیوال تک گئی تھی۔

رستے میں لوگ نعرے لگاتے تھے۔ ''عادل تیرے جانثار، بے شمار بے شمار'' عدی کو یہ نعرہ یاد ہو گیا تھا۔ جب وکلاء عادل تیرے جانثار کہتے تو وہ بھی ان کے ساتھ حلق پھاڑ کر بے شمار بے شمار کہتا تھا۔

''عدی، عادل کون ہے؟'' میں ہنس کر پوچھتی تو وہ بے اختیار اپنے ہاتھ پکڑے پلے کارڈ پر موجود تصویر پر ہاتھ رکھ دیتا تھا۔

فضا میں اتنا جوش، اتنا ولولہ بھرا ہوتا تھا کہ ایک نعرہ لگتا اور پچیس گھنٹے کے تھکا دینے والے سفر کے باعث تھکن سے چور جسموں میں ایک دم کرنٹ سا بھر جاتا۔ ''بے شمار بے شمار'' نعرے کا جواب انسانوں کے اس سمندر سے فوراً'' اور نہایت بلند آتا تھا۔ ایک عورت عادل کی بہت بڑی مداح تھی۔ وہ ہر شہر سے پیدل سفر کر کے ان جلسوں میں شرکت کرتی تھی۔ تین تین دن تک پیدل سفر کرنا اس کی عادل...... سے محبت اور عقیدت کی شدت کو ظاہر کرتا تھا۔ مجھے لگتا تھا اس شخص سے سب سے زیادہ محبت کرتی ہوں، سب سے زیادہ عقیدت مجھے ہے، مگر وہ عورت مجھ سے بھی آگے بڑھ گئی تھی۔

وہ جلسوں میں دعائیہ نعرے لگاتی تھی اور آگے سے لوگوں کو ''اے مولا'' کہنا ہوتا تھا۔ عدی کو یہ نعرہ بھی بہت پسند تھا۔

''وہ چلا کر کہتی ''تو...... لے لے''

''اے مولا!'' عوام کا جم غفیر ہاتھ اٹھا کر دعائیہ انداز میں جواب دیتا تھا۔

''تو دیکھ لے لے۔''

''اے مولا''

''میرا دیس بچا لے۔''

''اے مولا۔''

''میرا عادل بچالے۔''

''اے مولا۔''

بیس بیس گھنٹے تک نعرے لگانے اور تقریریں کرنے کے باوجود لوگ تھکتے نہ تھے۔

جب عادل اپنی گاڑی سے نکلتا، تو لوگ صرف اس کی ایک جھلک دیکھنے اس کا ہاتھ چومنے، اس باضمیر انسان کو صرف یہ بتانے کہ وہ اس سے کتنی محبت وعقیدت رکھتے ہیں، اپنے گھروں سے نکل کر سڑکوں پر آ جاتے۔ جب اس کا قافلہ سڑک پر سے گزر رہا ہوتا تو عورتیں فرط اشتیاق سے گھروں کی چھتوں پر چڑھ جاتیں۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں اس پر پھول برساتیں۔

پچھلے ساٹھ برس سے عوام کسی ایک شخص کے لیے یوں نہیں تڑپے تھے، کسی کا یوں والہانہ استقبال نہیں کیا تھا جیسے اس کا کیا گیا تھا۔ وہ کوئی سیاسی راہنما نہیں تھا، نہ وہ صدارت یا وزارت اعظمیٰ کا امیدوار تھا۔

اس دوران کتنے ہی اتار چڑھاؤ آئے، بارہ مئی کا قتل عام، رجسٹرار کا قتل، عوام کے ساتھ وحشیانہ سلوک اور بیسیوں دفعہ اس مرد جری کو قتل کرنے کی ناکام کوشش لیکن مجھے یقین تھا کہ عادل کو طاغوتی طاقتیں نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ جس شخص کے لیے کروڑوں عدیوں کی مائیں دعائیں کرتی ہوں، اس سے اللہ اپنی حفاظت کے پہرے نہیں اٹھایا کرتا۔

✡......✡......✡

''کاپیز چیک کر لی ہیں میں نے، فزا! آپ یہ ساری کلاس کو دے دیں۔'' میں نے اپنے بالوں کو کیچر میں سختی سے جکڑتے ہوئے فرنٹ سیٹ پر بیٹھی فزا کو مخاطب کیا۔ وہ مؤدب سی ہو کر اٹھی اور میز پر رکھی کاپیاں اٹھانے لگی۔

''مگر مس! یہ تو آپ نے چیک نہیں کیں۔'' وہ پہلی کاپی دیکھتے ہی حیرت سے بولی۔

''اچھا؟ چیک نہیں کیں؟'' میں نے آگے ہو کر میز پر رکھی کاپیاں اپنی جانب کھسکائیں۔

''چلو، ابھی کر دیتی ہوں۔'' خجالت مٹانے کو میں ہموار لہجے میں بولی، اندر ہی اندر مجھے خود پر بہت حیرت ہو رہی تھی۔ شاید میرا دماغ اتنا الجھا ہوا تھا کہ یادداشت مسلسل دھوکا دیے جا رہی تھی۔ تین کاپیاں چیک کر کے ہی میں نے بیزاری سے انہیں پرے کر دیا۔

''یہ آپ لوگ لے لیں۔ میں کل چیک کردوں گی اور اب بیٹھ کر منڈے کے ٹیسٹ کی تیاری کرلیں اور پلیز باتوں کی آواز نہیں آئے گی۔''

میری بات پر لڑکیوں کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی، وہ میرے انداز سے ہی سمجھ گئی تھیں کہ آج میں پڑھانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔

کچھ دیر میں بے چینی سے پہلو بدلتی رہی، پھر باہر نکل آئی۔ میرے نکلتے ہی کلاس سے شور بلند ہوا، مگر مجھ جیسی ذمہ دار اور ڈسپلن کی پابند ٹیچر کو ذرہ برابر بھی فرق نہ پڑا۔

چھٹی میں ابھی پانچ منٹ رہتے تھے۔ مگر میں چھٹی کی گھنٹی کا انتظار کیے بغیر ہی اسکول سے نکل آئی۔ ایک عجیب سی بے چینی اور بیزاری نے میرے پورے وجود کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔

''ماما...... مجھے ٹیچر نے دو گڈ دیے۔'' عدی نے مجھے دیکھتے ہی اپنی کاپی آگے کرکے دکھائی۔ اس کے چہرے پر خوشی رقصاں تھی۔

''آہ...... یہ بچے اتنے معصوم کیوں ہوتے ہیں؟'' بے اختیار میں نے سوچا، پھر مسکراتے ہوئے عدی کا گال تھپتھپایا۔

''اب بیگ بند کرواپنا۔'' میری بات پر اس نے کاپی بیگ میں ڈال لی۔

''اب زپ بند کرو۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے زپ بند کی۔ وہ بارہ سال کا ہو رہا تھا مگر خود انحصاری اس میں نہیں آئی تھی۔ وہ ابھی تک تھری کلاس میں تھا، اور جسامت وہی چھ، سات سالہ بچے کی تھی۔

اس کا بیگ میں نے اٹھا کر اس کا ہاتھ تھاما اور اسے لیے کلاس سے باہر آگئی۔

''ماما......'' باہر سڑک پر چلتے ہوئے اس نے ایک دم پوچھا۔ ''ہم پھر کب جائیں گے؟''

''کدھر؟'' ذہن میں خیالات کے ہجوم کے باعث میں نے قدرے عدم توجہی سے استفسار کیا۔

''وہیں ماما، جہاں عادل ہوتا ہے۔'' عدی نے مجھے سمجھانا چاہا، وہ کبھی اپنی بات دوسرے تک صحیح طریقے سے نہیں پہنچا سکتا تھا۔

''ہاں...... اچھا۔'' میں نے اس کی بات ٹھیک سے سنی نہیں تھی۔

''ماما...... پھر کب جائیں گے؟'' اس نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے پوچھا۔

''پتا نہیں......''

''ماما...... آپ چپ کیوں ہیں؟'' میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کیا، عدی؟''

''ماما! عادل کے پاس کب جائیں گے؟''

''اب نہیں جائیں گے۔'' میرے لہجے میں عجیب سی مایوسی تھی۔

''اب نہیں جائیں گے؟''

''نہیں......'' میں نے نفی میں گردن ہلائی، وہ قدرے مایوسی سے دوبارہ چلنے لگا۔

گھر پہنچ کر میں نے اس کے لیے کھانا نکالا، مگر خود میرا کھانے کو ذرہ برابر دل نہیں کر رہا تھا۔

''ماما...... پھر نہیں جائیں گے؟'' وہ اپنی بات ایک دفعہ پھر دہرا رہا تھا۔

''نہیں......'' نوالہ اس کے منہ میں دیتے ہوئے میں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ ابھی تک خود کھانا نہیں کھا سکتا تھا۔ ہر دفعہ میں اسے چھوٹے چھوٹے لقمے بنا کر کھلاتی تھی۔ اس نے پھر کچھ نہیں پوچھا، خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔

سہ پہر چار بجے سے کچھ اوپر کا وقت تھا، جب دروازے پر بیل ہوئی۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ میں نے ایک نظر اوپر دیکھا۔ میرا اللہ میری آخری امید تھا۔

دروازے پر میری ہمسائی ثمینہ ہوگی، مجھے یقین تھا۔ میرے گھر ٹی وی نہیں تھا، اور وہ یقیناً عادل کے متعلق فیصلہ سنانے آئی ہوگی۔ وہ بھی عادل کے لیے بہت دعا کرتی تھی، اس کا بھانجا ایک مدرسے کے خلاف ہونے والے آپریشن میں لاپتا ہو گیا تھا۔ اپنے یتیم بھانجے کا سراغ لگانے کے لیے اس کی آخری امید بھی عادل ہی تھا۔

بیس جولائی کی تاریخ تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ خود کو ہر قسم کی صورتحال کے لیے تیار کرتے ہوئے میں نے دروازہ کھول دیا۔

سامنے میری توقع کے عین مطابق ثمینہ کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا۔

''خوش خبری ہے ہم سب کے لیے؟'' اس نے ڈبہ میری طرف بڑھایا۔ میری مایوسیاں اور ان کے برعکس وہ مٹھائی کا ڈبہ، میری زبان بے اختیار ہکلائی۔

خوشی کے باعث اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ اس نے مٹھائی میری طرف بڑھائی۔ مگر میں، مٹھائی لینے

کے لیے ہاتھ بھی نہ بڑھا سکی۔ بس وہیں زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''کیا ہوا تمہیں؟'' وہ میری حالت پر پریشان ہو گئی تھی۔

''تم نہیں سمجھو گی ثمینہ۔'' میں روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''مجھے لگ رہا ہے، آج میں زندہ ہو گئی ہوں۔ نو مارچ کو مجھے لگا تھا کہ کسی نے میرا گلا گھونٹ دیا ہے۔ آج یوں لگ رہا ہے جیسے میں محفوظ ہوں، میرا عدی محفوظ ہے۔ اب کوئی عدی کو جعفر آباد جیل نہیں لے جا سکتا۔''

میں رو بھی رہی تھی اور ہنس بھی رہی تھی۔

✡......✡......✡

''تمہارا بچہ معذور ہے؟''

میں اسٹاف روم میں بیٹھی لڑکیوں کے پیپرز چیک کر رہی تھی جب انیلا نے پوچھا۔ میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''ہاں۔''

''اچھا......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''کہو انیلا۔'' میں نے پین کا کیپ چڑھا کر قدرے حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔ انیلا میری ساتھی ٹیچر تھی۔ اس نے پہلے کبھی اس موضوع پر بات نہیں کی تھی، مگر مجھے یقین تھا، وہ اب آگے عدی سے ہمدردی میں کچھ کہنے والی ہے۔

''تمہیں پتا ہے، بالاج بھی معذور ہے۔''

''بالاج کون......؟''

''تم بالاج کو نہیں جانتیں۔'' اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

بالاج عادل کا بیٹا تھا۔ میں صدمے کی سی کیفیت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''دیکھا جائے تو اولاد کی جانب سے بہت سے عظیم لوگ بدقسمت ہیں۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگی۔ ''چاہے وہ قائداعظم کی نافرمان اولاد ہو، علامہ اقبال کا ''شاہین بچہ'' ہو یا پھر افتخار چوہدری کا معذور بیٹا، اولاد ہر عظیم انسان کے لیے آزمائش ہوتی ہے اور اللہ اپنے نیک بندوں کی آزمائش کرتا ہے۔ یقیناً اللہ تم کو محبوب رکھتا ہوگا۔''

اس کی بات پر میں ہولے سے مسکرائی مگر اپنی مسکراہٹ مجھے بھی پھیکی لگ رہی تھی۔

''اچھا میں چلتی ہوں۔ اب تم سے چھٹیوں کے بعد ہی ملاقات ہوگی، وہ اٹھتے ہوئے کہنے لگی، آج ہمارے سمر کیمپ کا آخری دن تھا۔ اس نے مجھ سے مصافحہ کیا مگر میں ذہنی طور پر اتنی الجھی ہوئی تھی کہ ٹھیک سے اس کو خدا حافظ بھی نہ کہہ سکی۔

واپسی پر سارا راستہ میں اس کے متعلق سوچتی رہی تھی۔ وہ سات سالہ بچہ بالاج، وہ بھی معذور تھا۔ عدی کی طرح، میرے دل کو کچھ ہو رہا تھا۔

کیا عدی کی طرح اس سے بھی اس کے گھر والوں کے علاوہ کوئی پیار نہیں کرتا ہوگا؟ کیا سب کو اس بچے پر صرف ''ترس'' آتا ہوگا؟

جو محبت میں عدی کے لیے دل میں رکھتی تھی، وہی محبت مجھے اس بچے کے لیے محسوس ہو رہی تھی۔ میں ماں تھی، میرا اپنا بچہ معذور تھا۔ میں سمجھ سکتی تھی کہ انصاف کے اعلاترین منصب پر بیٹھا وہ شخص جو آج پاکستان میں سب سے زیادہ چاہا جاتا ہے، اپنے دل کے اندر کیسا نہ ختم ہونے والا دکھ رکھتا ہوگا۔ یہ دکھ میرے اندر بھی تھا...... میں یہ بھی جانتی تھی کہ عدی کبھی ٹھیک نہیں ہوگا، مگر پھر بھی میں ہر کوشش کرتی تھی، عدی کے لیے جتنا کر سکتی تھی کرتی تھی۔

میں سمجھ سکتی تھی کہ بالاج کا باپ کیسے دکھ سے دوچار ہے۔

✡......✡......✡

''یہ مٹھائی کھاؤ۔''

میں اپنے فلیٹ کے دروازے پر پہنچی ہی تھی کہ فوزیہ اپنے فلیٹ سے نکل کر سیدھی میری جانب آ کر بولی۔ اس کا چہرہ کسی انجانی خوشی سے دمک رہا تھا۔

میں نے خوشگوار حیرت سے مٹھائی کے ڈبے کو دیکھا، پھر ایک ٹکڑا اٹھالیا۔

''مگر یہ کس خوشی میں؟'' گلاب جامن منہ میں رکھتے ہوئے میں نے پوچھا۔

''عدی! تم بھی کھاؤ نا'' اس نے جھک کر ڈبہ عدی کے آگے کیا۔ جس نے قدرے شرماتے ہوئے برفی اٹھائی۔ وہ سیدھی ہو کر میری جانب متوجہ ہوئی۔

''میرے ایک رشتہ کے ماموں ہیں۔ ان کی شادی ہونے والی تھی۔ شادی میں چار دن تھے کہ دو سال پہلے انہیں پکڑ کر کسی نامعلوم مقام پر شفٹ کر دیا گیا تھا۔ ماموں کے گھر والوں نے انہیں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا، مگر وہ نہ ملے۔ پولیس نے ہیلپ کی نہ کسی انسانی حقوق کی تنظیم نے۔ چار دن پہلے ماموں کے بھائی نے عادل کو خط لکھا اور کل انہوں نے سپریم کورٹ میں سیکرٹری داخلہ کو طلب کر کے حکم دیا......

''مجھے یہ بندہ رات آٹھ بجے سے پہلے اسلام میں چاہیے۔''

اور یقین کرو ماموں رات آٹھ بجے سے پہلے اسلام آباد میں تھے۔ ہم سب بہت خوش ہیں۔ اللہ انہیں زندگی دے، میں ذرا یہ مٹھائی باقی گھروں میں بھی دے آؤں۔''

وہ خوشی خوشی کہتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

میں نے اطمینان سے اسے جاتے دیکھا۔ اب تو یہ اطمینان میرے وجود کا حصہ بن چکا تھا۔ اس روئے زمین پر کوئی تھا جو اللہ کے حکم سے عدل کرتا تھا۔

۞......۞......۞

جس دیس کے کوچے کوچے میں موت آوارہ پھرتی ہو جو دھرتی دکھ اگلتی ہو اور دکھ فلک سے گرتا ہو جہاں بھوکے ننگے بچے راہوں پر پل جاتے ہوں جہاں سچائی کے مجرم بھی زنداں میں ڈالے جاتے ہوں جہاں محسنوں اور لیڈرز کو بموں سے مارا جاتا ہو جہاں پہ کرسی کی خاطر کچھ بھی کر ڈالا جاتا ہو اس دیس کی مٹی برسوں سے دیکھ جگر پر سہتی ہے اور اپنے دیس کے لوگوں کو نئے غم سناتی رہتی ہے جانے کیوں قدرت کو کبھی میرا مطمئن و آسودہ ہونا منظور نہ تھا۔ میرا اطمینان ہمیشہ چند دن زندہ رہ کر مر جاتا تھا۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔

وہ اطمینان اور سکون جو میرے اردگرد پھیل سا گیا تھا، صرف تین ماہ بعد ختم ہو گیا۔ تین نومبر کو سب کچھ ختم ہو گیا۔ ایک سیلاب سا آیا تھا، پانی کا منہ زور ریلا، اپنی طاقت کے نشے میں گم، اندھا دھند آیا اور پھر امید، آس اور خوش گمانیوں کے کتنے ہی گھر اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔ جب وہ چلا گیا تو پیچھے کچھ بھی نہ بچا تھا۔ ہر شے ختم چکی تھی۔

اب اس ملیا میٹ ہوئی جگہ پر چھوٹے عدل کی نئی عمارتیں قائم ہونے لگیں، نئے فیصلے دیے جانے لگے، انصاف کی مصلحت زدہ تشریح مارکیٹ میں آ گئی اور عدل۔ عدل تو ساٹھ گھروں میں کسی قیدی کی طرح بند ہو کر رہ گیا۔

میں نے آمر وقت کا بیان اخبار میں پڑھا۔ ''چیف جسٹس کو اللہ نے بہت عزت دی تھی، مگر انہیں عزت راس نہیں آئی۔''

''ہونہہ...... عزت راس نہ آنے کی بات وہ لوگ کر رہے تھے، جنہوں نے خود کبھی عزت، محبت اور عقیدت کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔

وہ شخص سزا کا مستحق تھا۔ اس نے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے خلاف اتنی بڑی سازش کی تھی جو شاید پورے ساٹھ برسوں میں کوئی نہ کر سکا۔ اس ''بدعنوان'' جج کے خلاف ''دودھ میں دھلی'' حکومت کا ریفرنس بالکل صحیح تھا۔ بھلا وہ ایک قانون دان کون ہوتا تھا اسٹیل مل کے معاملے میں ٹانگ اڑانے والا؟ اس کو کس نے یہ حق

دیا تھا کہ ایک گروہ کو پاکستان کا اثاثہ بیچنے سے روکے؟ اس کی کیا مجال جو امریکہ کو بیچے جانے والے پاکستانیوں کے متعلق پولیس کو کٹہرے میں لا کر جرح کرے؟ پاکستانی عوام اور پاکستانی اثاثے بیچنے کے لیے تو بنے تھے۔ ان کو کھانے کا ''حق'' نہایت ''آئینی'' طریقے سے بننے والے صدر اور ''شفاف'' طریقے سے بننے والی حکومت کو پیدائشی طور پر حاصل تھا۔

میرے منہ تک جاتا نوالہ ایک جھٹکے سے پلیٹ میں واپس گرا۔ میں ساکت سی ہو کر اخبار میں لگی سرخی پڑھ رہی تھی۔

''وہ ایک تیسرے درجے کے گھٹیا انسان اور زمین کی غلاظت ہیں۔''

یہ بیان تھا میرے اعلا، باکردار، پاکستان کے لیے قدرت کے انمول تحفے کا۔

میں ان الفاظ کو دیکھ کر رہ گئی۔

وہ شخص گند اور غلاظت تھا جس نے میرے بچے کو جیل کی کوٹھڑی سے باہر نکال کر اسپتال پہنچایا تھا؟ وہ شخص تیسرے درجے کا انسان تھا، جو عوام کے ساتھ عدل کرتا تھا؟ کیا کوئی گالی اس سے بڑی بھی ہو سکتی ہے جو آمر وقت نے میرے عادل کو دی تھی۔

یہ زبان، یہ لب و لہجہ ایک اعلا عہدے والے شخص کے لیے کتنا غیر موزوں تھا، پاکستان کا بچہ بچہ جانتا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا، تو وہ یہ کہنے والا تھا۔

میں سوچ رہی تھی، عادل کو اس کے خلاف ایک مذمتی بیان تو جاری کرنا چاہیے۔ اس کو حکمرانوں کو یہ بتانا چاہیے کہ وہ خود کتنے پانی میں ہیں۔

لیکن جب میں نے اگلے دن کے اخبارات میں پڑھا۔ انہوں نے بات کو ہنس کر ٹال دیا ''اس کا جواب دینا میرے عہدے کی شان کے خلاف ہے۔''

تو میں بے اختیار رو پڑی۔ مجھے آج اندازہ ہوا تھا کہ عظمتوں کی بلندی کو چھونے والا انسان کیسا ہوتا ہے۔

✡ ...... ✡ ...... ✡

''ماما۔ میں کھود (خود) نہاؤں گا۔'' عدی کے یوں کہنے پر میرے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے سامنے کیا اور سیدھا اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے شرارت چھپا کر بولی۔

''تو میرا بیٹا اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ خود نہا سکے؟'' پلکیں سکیڑ کر میں نے پوچھا تو عدی نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ماما۔ عدی کھود نہائے گا۔ ماما عدی جھوٹ نہیں بولتا۔'' جب عدی کو یہ کہنا ہوتا کہ وہ صحیح کہہ رہا ہے، وہ کہتا ''عدی جھوٹ نہیں بولتا۔''

''چلو۔ آج میرا بیٹا خود نہائے گا۔'' میں نے پیار سے اس کا گال تھپتھپایا اور پھر الماری سے اس کے کپڑے نکالنے لگی۔ ایک جینز اور شرٹ نکال کر میں نے بیڈ پر رکھی، وہ خاموشی سے یہ تمام کارروائی دیکھتا رہا۔

''عدی۔ ان ہیلر تو نہیں چاہیے نا؟ سانس ٹھیک آ رہا ہے؟'' الماری سے صاف تولیہ نکال کر جب میں باتھ روم میں لٹکا رہی تھی تو یکدم کسی خیال کے تحت میں نے وہیں سے بلند آواز میں پوچھا۔

''نہیں۔ ماما۔'' اس نے وہیں کمرے سے اونچی آواز میں جواب دیا۔

''گڈ بوائے۔'' میں واپس کمرے میں آئی، اس کے کپڑے اٹھائے اور اس کی انگلی پکڑ کر اسے باتھ روم میں لے آئی۔

شاور چلا کر میں نے گرم پانی سیٹ کیا۔

''تم صابن لگاؤ میں آتی ہوں۔''

میں مطمئن سی ہو کر واپس کچن میں آ گئی۔

دیگچی میں گھی گرم ہو رہا تھا، میں نے پلیٹ میں کٹی پیاز اس میں ڈال دی۔

''مجھے بجٹ کنٹرول کرنا پڑے گا۔'' میں خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی۔ مہینہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا اور میری تنخواہ ختم ہونے والی تھی۔

''مجھے کچھ ٹیوشنز لے لینی چاہئیں۔'' میں نے جیسے خود سے فیصلہ کیا تھا۔

کفگیر میں نے سائیڈ پر رکھا اور دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی عدی کے پاس آ گئی۔

دروازے کی چوکھٹ پر ہاتھ باندھے اور مسکراہٹ دبائے میں کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ وہ خود جسم پر صابن لگا رہا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے سر جھٹکا۔

''ماما۔ عدی کھود (خود) نہائے گا۔'' اس نے مجھے مطمئن کرنا چاہا۔

''اچھا میں آتی ہوں۔''

میں واپس کچن میں چلی آئی۔ پیاز ہلکی ہلکی گولڈن براؤن ہو چکی تھی۔ میں نے اس میں کفگیر ہلایا، پھر دوسرے مسالے ڈالنے لگی۔

چاول بھگو کر میں پہلے ہی رکھ چکی تھی، اس لیے ذرا وقت ملا تو ان میں سے پانی نتھارنے لگی۔

''ماما۔ ماما'' عدی کے رونے کی آواز پر میرے ہاتھوں سے چاولوں والا برتن چھوٹ گیا۔ میں ان کی پروا کیے بغیر دیوانہ وار بھاگتی ہوئی اپنے کمرے تک آئی۔

''عدی۔ عدی۔'' وہ روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے زمین آسمان گھومنے لگے۔

''عدی۔ کنڈی کھولو۔'' میں زور سے چلائی۔ مجھے یاد آ رہا تھا، صبح اس کو استھما اٹیک نہیں ہوا تھا اور اس وقت عموماً اسے اٹیک ہوا کرتا تھا۔

''ماما۔ نہیں کھلتی۔'' خوف کے مارے وہ اونچی آواز میں رونے لگا۔

''عدی۔ جج...... جیسے لگائی تھی ویسے ہی کھولو۔'' میری آواز کپکپا رہی تھی میں نے بے اختیار پیشانی پر آیا پسینہ پونچھا۔ میرا دل اتنی بری طرح دھڑک رہا تھا کہ مجھے لگا، وہ ابھی سینہ پھاڑ کر باہر آ جائے گا۔۔

''نہیں کھلتی۔'' وہ زور زور سے رو رہا تھا۔ ساتھ ساتھ دروازہ بھی بجا رہا تھا۔'' ماما۔ داز ا کھولو۔ داز ا کھولو۔

''عدی میری جان! کنڈی کھولو۔'' اس کی بات پر میرے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔

''شاور کے نیچے جاؤ، سر دھوؤ۔ جلدی سے۔'' شدید بے بسی کا عالم تھا، میرا دل تڑپ رہا تھا مگر میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

پانی گرنے کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ یعنی شاور چلا ہوا تھا مگر عدی اس کے نیچے نہیں جا رہا تھا، عدی خود سے کوئی کام بھی نہیں کر سکتا تھا۔

''عدی...... پانی ڈالو منہ پر'' میری برداشت ختم ہو رہی تھی، مجھے لگا اگر...... چند لمحوں تک عدی باہر نہ آیا تو میرا دل بند ہو جائے گا۔

''عدی۔ خدارا کچھ کرو۔'' میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میرا ایک ہی بیٹا تھا، اس کو بھی اللہ مجھ سے دور کر رہا تھا۔ میں کیا کروں؟ میں کدھر جاؤں؟

اس کا رونا قدرے کم ہوا۔

''عدی...... پانی ڈالا ہے منہ پر؟'' میں نے بے چینی سے بند دروازے کو دیکھا۔

''ماما۔ پانی ڈالا ہے۔'' مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔

''آنکھ جل رہی ہے اب؟''

''ماما۔ کنڈی کھولو۔'' وہ خود بھی دروازے کو بجانے لگا۔ وہ ابھی تک رو رہا تھا۔ شاید اب اس کی آنکھ جلنا بند ہوگئی تھی۔

''میں کیسے کھولوں؟ تم کھولو۔ یہ جو ڈنڈی ہے کنڈی کی، اسے بائیں جانب کھینچو۔'' میں نے اسے سمجھانا چاہا، مگر عدی نہیں سمجھ سکتا تھا، یہ بات میں بخوبی جانتی تھی۔ میرا دل ڈوبنے لگا

باتھ روم میں ڈور لاک کی جگہ دائیں سے بائیں کھلنے والی کنڈی نصب تھی۔

''ماما۔ نہیں کھلتی۔''

میں زور زور سے دروازے کو دھکا دینے لگی مگر وہ لکڑی کا مضبوط دروازہ توڑنا میرے جیسی کمزور عورت کے بس کی بات نہیں تھا۔

''عدی! تم ڈرنا نہیں، میں کسی کو بلا کر لاتی ہوں۔'' کہہ کر میں بھاگتی ہوئی باہر گئی۔

ثمینہ کے فلیٹ کی گھنٹی بجاتے ہوئے میں مسلسل رو رہی تھی۔ جب گھنٹی پر دروازہ نہ کھلا تو میں نے اسے زور زور سے بجانا شروع کر دیا۔

عارف بھائی گھبرائے ہوئے باہر نکلے۔

''کیا ہوا بھابھی؟'' مجھے روتا دیکھ کر وہ پریشان ہو گئے۔

''عارف بھائی۔ عدی...... عدی باتھ روم میں بند ہو گیا ہے۔''

میں سسکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی۔ ''اس سے کنڈی لگ گئی ہے، کنڈی نہیں کھل رہی۔ کچھ کریں عارف بھائی۔''

آواز سن کر ثمینہ بھی بھاگی چلی آئی۔

''آئیں بھابھی۔ دیکھتے ہیں۔'' عارف بھائی اور ثمینہ فوراً میرے ساتھ چلے آئے۔

جس وقت دوبارہ ہم فلیٹ میں داخل ہوئے، ایک دم بجلی چلی گئی۔ شام چھ بجے کا وقت تھا، اندھیرا ویسے بھی ہونا شروع ہو گیا تھا۔ یقیناً باتھ روم میں بھی بے حد اندھیرا ہوگا۔ عدی کو ڈر لگ رہا ہوگا۔

''عدی۔عدی۔''میں نے زور زور سے دروازہ بجایا۔دوسری جانب ہنوز خاموشی تھی۔

''عدی۔خدا کے لیے کچھ بولو۔''میں پاگلوں کی طرح چلائی۔ثمینہ نے بے اختیار مجھے شانوں سے تھام لیا۔

عارف بھائی دروازے کو دھکا دینے لگے۔

''عدی!بولو،خدا کے لیے عدی بولو۔اوہ میرے اللہ!عدی بول کیوں نہیں رہا؟''میں بلند آواز میں روتے ہوئے چیخنے لگی تھی۔

''ماما......ما''اس کی کراہتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔''ماما۔ان ہیلر۔''

''عدی۔نہیں۔''میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

مجھے لگا وقت سات برس پیچھے چلا گیا ہے۔میں اور عدی جعفر آباد کی اس خوفناک جیل میں ہیں۔ میرے سامنے وہ ان ہیلر کے لیے تڑپ رہا ہے،اس کے ہاتھ پاؤں نیلے پڑ رہے ہیں۔آج میرے پاس ان ہیلر تو تھا،مگر عدی نہیں۔

میں ایک دفعہ پھر جعفر آباد جیل پہنچ گئی تھی۔عدی ایک دفعہ پھر ان ہیلر کے لیے استھما اٹیک کے باعث بن پانی کے مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔

میں تصور کی آنکھوں سے اسے دیکھ سکتی تھی۔اس کا زرد پڑتا چہرہ، نیلے ہوتے لب، پسلیوں کے درمیان کھنچتی جلد مجھے سب دکھائی دے رہا تھا۔

''ماما!اندھیرا ہے۔ماما ان ہیلر۔''وہ مجھ سے چیخ چیخ کر ان ہیلر مانگ رہا تھا اور میں...... میں بے بسی۔بے چارگی سے رو رہی تھی۔

میرا بیٹا،جس سے مجھے بے پناہ محبت تھی، اندر مر رہا تھا۔ میں اس کو نہیں بچا سکتی تھی۔ وہ ایک اندھیرے کمرے میں بند ہو چکا تھا۔ میں بے بس تھی، بے حد بے بس۔اس وقت اگر کوئی مجھ سے کہتا کہ اپنا جسم کاٹ کر دے دو،تمہارے بچے کی جان بچ جائے گی،تو میں دے دیتی۔کوئی کہتا اپنا ضمیر بیچ دو، میں بیچ دیتی۔ عارف بھائی دو تین اور لوگوں کو بھی لے کر آ گئے تھے۔اور وہ سب دروازے کو دھکا لگا رہے تھے اور عدی مسلسل رو رہا تھا۔اور پھر ایک زوردار آواز کے ساتھ دروازے کی کنڈی ٹوٹ گئی۔دروازہ اندر کی جانب جھٹکے سے کھلتا چلا گیا۔میں بھاگتی ہوئی دیوانہ وار اندر گئی اور اپنے ہاتھ میں پکڑا ان ہیلر عدی کے لبوں سے لگا دیا۔جلدی جلدی

عدی کو دوائی کے چار پف دینے کے بعد میں نے اسے تولیے میں لپیٹا اور باہر آ گئی۔

میں ابھی تک ہچکیوں سے رو رہی تھی، عدی بھی رو رہا تھا۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ میری روح کانپ رہی تھی۔

''عدی بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔ تم مت روؤ۔'' ثمینہ میرے آنسو پونچھنے لگی مگر میں عدی کے لیے نہیں رو رہی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں ثمینہ۔'' زبردستی خود پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے میں نے کہا'' اور جو احسان تم نے مجھ پر کیا، ثمینہ۔ تم نے اور عارف بھائی نے میں وہ ساری زندگی نہیں بھلا پاؤں گی۔ میں...... میں......'' میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے کچھ کہنے سے روک دیا۔

''ہم نے کوئی احسان نہیں کیا۔ جو کچھ کیا ہے اللہ نے کیا ہے۔'' کتنی ہی دیر وہ بیٹھی مجھے تسلی دیتی رہی، سمجھاتی رہی۔ اس کے جانے کے بعد میں پھر رونے لگی تھی۔

عدی کو سختی سے اپنے بازوؤں میں جکڑے میں بری طرح رو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے زہر آلود خنجر ہے جو میرے دل میں اترتا جا رہا ہے۔ میں عدی کے لیے نہیں رو رہی تھی، میں اپنے لیے بھی نہیں رو رہی تھی۔

کتنے ہی پل یونہی بیت گئے پھر بجلی آئی تو میں آنسو پونچھ کر اٹھی، عدی کو صاف کپڑے پہنائے۔ اس کے بالوں میں کنگھی کی اور پھر اس کے جوتوں کے تسمے باندھنے لگی۔ وہ سہمی سہمی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

میں اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے اسے کچن تک لے آئی۔ چولہا ابھی تک جل رہا تھا۔ پیاز اور گھی جل کر سیاہ ہو چکے تھے۔ میں نے چولہا بند کر دیا، میز پر سے ڈبل روٹی کا پیکٹ اٹھایا، توس گرم کر کے ان پر جیم لگائی، پھر وہ عدی کے سامنے رکھ دیے۔ وہ انہیں کھانے لگا۔ میں اسے ٹوسٹ کھاتے دیکھتی رہی۔ خود مجھے ذرہ برابر بھی بھوک نہ تھی۔ میرا خون ابھی تک خشک تھا۔ میرا دل ابھی تک زور زور سے دھڑک رہا تھا، اس نے ٹوس کھا لیے تو میں اس کا ہاتھ تھام کر اسے باہر لے آئی۔

''ماما...... کہاں جا رہی ہو؟'' وہ سہمی سہمی آواز میں پوچھ راہ تھا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموشی سے فلیٹ کی سیڑھیاں اترنے لگی۔ آنسو ایک دفعہ پھر میری آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔

''ماما۔ روتی کیوں ہو؟'' میرا ہاتھ تھامے میرے ساتھ چلتے ہوئے عدی پوچھ رہا تھا۔ میں نے

آنسوؤں کی دھند میں اسے دیکھا تھا۔ میں اسے کیا بتاتی کہ میں کیوں رو رہی ہوں۔

ایک رکشہ روک کر میں نے اسے مطلوبہ ایڈریس۔ بتایا۔ رکشہ والے نے حیرت سے میری جانب دیکھا۔

''دس روپے اوپر دے دوں گی بھائی۔'' عدی کے ہمراہ میں رکشہ میں بیٹھ گئی۔

پندرہ منٹ بعد رکشے والے نے ہمیں وہاں اتار دیا۔ میں نے خاموشی سے کرایہ ادا کیا اور عدی کی انگلی کو اور بھی مضبوطی سے پکڑے رکشہ سے نیچے اتر آئی۔ سامنے ایک لمبی سڑک تھی۔ سڑک کے دونوں اطراف خوبصورت اور ایک جیسے گھر بنے تھے۔ اس سڑک کے آخری کنارے پر ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی اس پہاڑی پر اس کالونی کا آخری گھر تھا۔ اس گھر کی چھت باقی تمام گھروں کی طرح سرخ اور مخروطی تھی۔

وہ آخری گھر مجھے اس جگہ سے دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر اس کالونی کے آخری گھر کے اندر مقید سات سالہ بالاج افتخار صاف دکھائی دے رہا تھا۔

میرے آنسوؤں میں شدت آگئی، یہ آنسو عدی کے لیے نہیں یہ تو اس قیدی بچے کے لیے تھے۔

جس وقت عدی باتھ روم میں بند تھا، اس وقت پہلی بار مجھے احساس ہوا تھا کہ اسلام آباد کی اس اونچی پہاڑی کا قیدی کیا تھا؟ اس وقت مجھے علم ہوا تھا کہ عادل کیا تھا؟

وہ صرف منصف اعلا نہیں تھا، وہ ایک سات سالہ معذور بچے کا باپ بھی تھا اس کے بچے کا آپریشن نومبر میں ہونا تھا۔ دس ڈاکٹرز کا پینل اس کے بچے کا معالج تھا ہر مہینہ ہسپتال لے جا کر اس کا چیک اپ کرانا ہوتا تھا۔

وہی بالاج بالکل اسی طرح پچھلے چار ماہ سے اس سرخ چھت والے گھر میں اس طرح قید تھا جیسے عدی باتھ روم میں صرف دس منٹ بند رہا تھا۔ دس منٹ میں میری یہ حالت تھی کہ میں اپنے بچے کو اس ''قید'' سے نکالنے کے لیے اپنا جسم کاٹنے پر بھی تیار تھی، اپنی گردن بھی کٹوا سکتی تھی، اپنا ضمیر بھی بیچ سکتی تھی۔

اور سرخ چھت والے اس گھر میں بند وہ قاضی وقت کس دل کا مالک تھا کہ ابھی تک حق کے لیے اڑا ہوا تھا، اب بھی جھکنے کو تیار نہ تھا۔

عدی جب اس اندھیرے کمرے میں بند تھا تو رو رہا تھا۔ اس کے رونے سے مجھے اپنا دل بند ہوتا محسوس ہوتا تھا۔

''بالاج بھی ایسے ہی روتا ہوگا۔ کیا اس کے باپ کا دل نہیں بند ہوتا ہوگا؟''

عدی مجھے پکار رہا تھا ''ماما مجھے یہاں سے نکالو یہاں اندھیرا ہے، مجھے ڈر لگتا ہے۔''

بالاج بھی تو اس سے کہتا ہوگا ''بابا! مجھے یہاں سے نکالو۔'' اسے بھی تو ڈر لگتا ہوگا، وہ بھی تو کمرے میں بند رہ کر گھبراتا ہوگا۔

عدی جب بغیر دوائی کے تڑپ رہا تھا تو میری ہمت، حوصلہ سب جواب دے گیا تھا۔ اس وقت مجھے لگا تھا کہ مجھے جس در پر بھی اپنے بیٹے کے لیے جھکنا پڑا میں جھک جاؤں گی۔

اور وہ ننھا سا معذور بچہ۔ وہ بھی تو باپ سے دوائی مانگتا ہوگا۔ اسے بھی تو درد ہوتا ہوگا۔ وہ بھی تو روتا ہو گا۔ باپ کی منتیں کرتا ہوگا کہ کہیں سے وہ اس کو دوائی لا کر دے۔ جب وہ تڑپتا ہوگا تو اس کا باپ کیا کرتا ہوگا؟ کیا اسے دکھ نہیں ہوتا ہوگا؟ کیا اس کا دل اپنے بچے کی حالت دیکھ کر نہیں ڈوبتا ہوگا؟ پھر بھی، اپنے بچے کو اپنے سامنے روتے بلکتے دیکھ کر بھی وہ آدمی ڈٹا ہوا تھا۔

وہ اب بھی کہتا تھا کہ میں نہیں جھکوں گا، چاہے تم مجھے سونے میں بھی کیوں نہ تول دو۔ اپنے منصب عدل سے نہیں ہٹوں گا، دیکھتا ہوں، تم مجھے کیسے روکتے ہو۔

وہ کس لیے یہ سب کر رہا تھا؟ اپنے لیے؟

ہرگز نہیں۔

وہ کس کے لیے اپنے بچے کی زندگی داؤ پر لگا رہا تھا؟

اپنے عہدے سے ایمان داری کے لیے؟

نہیں۔

مصلحت اور فتویٰ کہتا تھا کہ وہ اپنے بچے کے لیے ہی سہی مستعفی ہو جاتا مگر وہ فتوے کے بجائے تقویٰ پر عمل کرنے والا شخص یہ سب صرف اور صرف اپنی قوم کے لیے، اپنا ملک کے لیے کر رہا تھا۔

عدی کا ہاتھ تھامے ججز کالونی کی طرف بڑھتے ہوئے زندگی میں پہلی بار مجھے لگا تھا کہ عادل بے وقوف ہے، وہ اس قوم کے لیے اپنے بچے کی زندگی داؤ پر لگا رہا تھا جو اسکے خاندان کی نظر بندی کو ایک خبر سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ جو خبرنامے میں یہ خبر سنتی ہے کہ

''بالاج کو چار ماہ سے دوائی نہیں ملی۔''

''منیر ملک کے گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا۔''

''علی احمد کرد کی حالت جیل میں بگڑ گئی۔''

''شاہد صدیقی کو گھر سے بے دخل کر دیا گیا۔''

''منصف اعلا کے بچوں کو گھر کے برآمدے میں آنے کی اجازت بھی نہیں ہے۔''

اور یہ قوم اطمینان سے ان خبروں کو سن کر ان پر تبصرہ کرتی ہے، کھانا کھاتی ہے، پھر سو جاتی ہے اور جب صبح اٹھتی ہے تو روتا بلکتا بالاج اور اس کا باپ اس قوم کے ذہن سے محو ہو چکا ہوتا ہے۔

اندھیرے میں ڈوبی کالونی کی جانب بڑھتے ہوئے میرے قدم رک گئے۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا پیچھے روشنی تھی، زندگی کی روشنی اور سامنے موت کا سا سناٹا اور اندھیرا تھا۔

میں آج اگر اپنے پیچھے موجود روشنیوں میں ڈوبے کسی بھی گھر کے مکینوں سے عادل اور اس کے ساتھ ساتھیوں کے متعلق پوچھتی تو ہر شخص ان کا نام عزت واحترام سے لیتا، ان کو سلیوٹ کرتا، ان کو زبردست خراج تحسین پیش کرتا، ان کو ''میر کارواں'' اور ''امام خمینی'' قرار دیتا۔

اور جب میں یہ پوچھتی کہ آپ نے ججز کی بحالی کے لیے کیا کیا؟

کیا آپ سڑکوں پر نکلے؟ رکاوٹیں عبور کر کے ججز کے گھروں تک جا پہنچے؟'' تو مجھے یقین ہے کہ ہر شخص سر جھکا کر کہتا۔

''ریلیوں پر پولیس لاٹھی چارج کرتی ہے، اگر میں مارا گیا تو میرے بچوں کا کیا ہو گا؟''

''عادل واقعی احمق تھا۔ وہ اس قوم کے لیے اپنے اصولوں کے سامنے اور بچوں کو پس پشت ڈال رہا تھا جو اس سے اپنی اولاد سے زیادہ محبت نہیں رکھتے۔''

میں نے ایک تاسف بھری نگاہ ان روشنیوں پر ڈالی۔

شاید ہم لوگ اس قابل ہی نہیں ہیں کہ کوئی عادل منصف ہمیں ملے، اور کوئی وجیہہ الدین جیسا قابل ذہین اور ایمان دار شخص ہمارا صدر ہو۔ شاید ہم اتنے گناہ گار ہیں کہ ہمارے لیے امپورٹڈ وزیر اعظم باوردی صدر جیسے لوگ ہی مکافات عمل ہیں۔

کالونی کے دہانے پر خاردار تاروں کی باڑ لگی ہوئی تھی۔ پولیس اور رینجرز کی ایک بھاری تعداد وہاں تعینات تھی یوں لگتا تھا جیسے خاردار تاروں کے اس پار گوانتانامو بے تھا جس میں عالمی دہشت گرد مقید تھے۔ میں

آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان خارداروں کے قریب جانے لگی۔ مجھے دیکھتے ہی پہرے پر موجود مسلح افراد چوکنے ہو گئے۔ سب سے آگے کھڑے سپاہی نے اپنی بندوق سیدھی کرلی۔

''مجھے آگے جانا ہے۔'' میں نے رینجر سے درخواست کی۔

اس رینجر نے قدرے تاسف سے مجھے دیکھا۔ ''حکم نہیں ہے بی بی!''

''اللہ کا حکم مانو، فرعون کا نہیں۔ تمہیں تو اللہ ہی کو حساب دینا ہے نا؟'' میری آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے'' کیا نام ہے تمہارا بی بی؟'' دوسرے سپاہی نے آگے بڑھ کر کڑی نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے استفسار کیا۔

''میرا کوئی نام نہیں ہے۔ میں۔ میں ایک ماں ہوں۔ عادل نے میرے بچے کی جان بچائی تھی۔'' آنسو میرے چہرے پر پھسلتے جارہے تھے۔

''اس کا بچہ بیمار ہے، اس نے چار مہینوں سے دوائی نہیں لی۔ معذور بچے کی آہ مت لو۔''

مجھے بہت شدت سے جعفر آباد جیل یاد آئی تھی۔

''جاؤ بی بی۔'' پولیس افسر آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ میں نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

تھکے شکستہ قدموں سے میں پلٹ آئی۔ عدی کی انگلی پکڑے کتنی ہی دیر میں اندھیروں میں ڈوبی کالونی سے مخالف سمت میں چلتی رہی، یہاں تک کہ میرا وجود اسلام آباد کی روشنیوں میں نہا گیا مگر میرا دل ابھی تک اس اندھیرے میں گھرے سرخ چھت والے گھر میں تھا۔ میری روح کا ایک ٹکڑا وہیں کہیں پہاڑی کے اس قیدی کے پاس رہ گیا تھا۔

مجھے اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ ملک ڈکٹیٹر شپ سے چلتا ہے یا جمہوریت سے۔

مجھے اس بات کی بھی کوئی پریشانی نہ تھی کہ کس کا اقتدار ہے، کس نے جانا ہے اور کس نے اب آنا ہے۔

میری تو صرف ایک آرزو، تمنا اور خواہش تھی، صرف ایک دعا تھی کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں، ہم غریبوں کے ساتھ عدل کرنے والا وہ واحد انسان اپنے منصب عدل پر واپس آجائے۔

مجھے تو صرف یہ یاد تھا کہ اس شخص نے میرے بچے کی جان بچائی تھی۔ آج اس کا اپنا بچہ انہی حالات کا شکار تھا اور میں۔ میں اتنی کم ظرف تھی کہ اس کا احسان بھی نہیں اتار رہی تھی۔ وہ میرا محسن تھا، اور آج میں بے بسی

سے اس کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ بے بسی، بے چارگی، مظلومیت۔ یہ مجھے اور میری قوم کو ورثہ میں ملا تھا۔

مجھے نہیں پتا میں کدھر جا رہی تھی۔ عدی کی انگلی تھامے شکست خوردہ قدموں سے فٹ پاتھ پر چلتی ہوئی میں جانے کب سپریم کورٹ آف پاکستان کے سامنے آ گئی۔

جب وہ شخص اس سفید عمارت میں اپنے چیمبر پر بیٹھتا تھا تو میں روز وہاں سے گزرتے ہوئے فٹ پاتھ پر اس ملک کے معصوم شہریوں کو کھڑے دیکھتی تھی۔ وہ لوگ ہر صبح اس جگہ اپنے عزیزوں کی تصویریں اٹھائے کھڑے ہوتے۔ ان کے چہروں پر دکھ کے ساتھ امید بھی رقم ہوتی تھی جب اسے کسی جھوٹے سرکاری افسر کا جھوٹا بیان ملتا تو وہ اس فائل کو اٹھا کر اس کے منہ پر مارنے کی شہرت رکھتا تھا۔

آج وہ فٹ پاتھ ویران تھا۔ وہاں صرف خاموشی تھی...... خاموشیوں کے درمیان دم توڑتی امیدوں کی آخری سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ اس کے ٹمٹماتے بجھتے دیے کا سایہ مجھے اس پتھریلی فٹ پاتھ پر صاف دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے ایک نظر اس سفید مرمریں عمارت پر ڈالی۔ رات کے اس پہر سفید دیواروں کے پار عادل کے چیمبر میں گہرا سناٹا محیط ہوگا۔ اس کی کرسی، اس کا ڈیسک، قلم، فائلیں، درخواستوں کا پلندہ، اس کی فیکس مشین، سب خاموشی سے رو رہے ہوں گے۔ مجھے ان کی سسکیاں واضح سنائی دے رہی تھیں۔

میں اور عدی تھک ہار کر اس فٹ پاتھ پر بیٹھ گئے۔ میری نظریں عمارت پر بنے ترازو پر مرکوز ہو گئیں۔

"فاحکم بین الناس بالعدل۔"

میں نے ایک تھکی تھکی نگاہ اللہ کے اس حکم پر ڈالی۔ اس حکم پر عمل کرنے والا شخص دور کہیں اس اونچی پہاڑی پر بنے سرخ چھت والے گھر میں قید تھا۔

میری آنکھوں سے ایک دفعہ پھر آنسو بہنے لگے۔

۞......۞......۞